Regd. L. No.7243 Phone. 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1971

سچے مولوی

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ کے ساتھ سفر میں تھے۔ بعض نے ہم میں سے روزہ
رکھا اور بعض نے نہیں رکھا۔ ہم ایک دن ایک منزل میں اترے۔ جن لوگوں نے روزہ رکھا تھا وہ سخت
نڈھال ہو کر آرام کرنے لگے اور جن لوگوں نے روزہ نہیں رکھا تھا وہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔
چنانچہ انہوں نے خیمے کھڑے کئے اور اونٹوں کو پانی پلایا۔ رسول اللہ نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ آج تو
وہ لوگ جنہوں نے روزہ نہیں رکھا تھا سارا ثواب لے گئے۔

(بخاری، مسلم بحوالہ مشکوٰۃ)

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ **طلوعِ اسلام** لاہور

ٹیلیفون ۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی، گلبرگ ۲۔ لاہور

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

بدل اشتراک
پاکستان
سالانہ دس روپے
غیر ممالک
سالانہ ایک پونڈ

جلد ۲۴ — نومبر ۱۹۷۱ء — نمبر ۱۱

فہرست

۱۔ لمعات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲

۲۔ طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳

۳۔ طلوعِ اسلام کی چودہویں سالانہ کنونشن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴

۴۔ طلوعِ اسلام کالج فنڈ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۶

۵۔ تحریکِ پاکستان کی کہانی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۷

۶۔ مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۴

۷۔ حقائق و عبر۔ (نظریہ پاکستان) (مشرقی پاکستان میں کیا ہوا) ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۴۹
(شب برات) (بجم ہنوز نظاند رموز دیں ۔ ورنہ) (ابتدائے عشق ہے)
(چبھتے ہوئے نشتر) (عوام کا حافظہ اتنا کمزور نہیں)

۸۔ سنورا شُد! ۔۔۔۔۔ (بیگم نصرت جہاں بیگ) ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۱

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

صدر مملکت نے اپنی ۱۲ اکتوبر کی نشریاتی تقریر میں اعلان کیا ہے کہ مجوزہ دستور پاکستان کا مسودہ جسے ان کی متعین کردہ مجلس ماہرین نے مرتب کیا ہے، ۲۰۔ دسمبر کو شائع کر دیا جائیگا۔ اور اس کے بعد سے ۲۷۔ دسمبر کو پارلیمان کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ کہ وہ اس پر غور و خوض کرے۔ اور اپنی ترامیم اسی دن کے اندر صدر کے پاس بھیجے تاکہ وہ ان کے متعلق فیصلہ کر کے دستور کو نوے دن کی کل مدت کے اندر نافذ کر دے۔ ہمارے خیال میں یہ زیادہ مناسب ہوتا کہ مسودۂ دستور پارلیمان کے سامنے جانے سے کافی عرصہ پہلے شائع کر دیا جاتا تاکہ قوم کے ارباب فکر و نظر اس پر اچھی طرح غور کر کے اپنی آراء اور مشورے پبلک کے سامنے لا سکتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسودۂ دستور کے متعلق ترامیم پیش کرنے کا آئینی حق ارکان پارلیمان ہی کو حاصل ہوگا۔ لیکن قوم کے صائب الرائے طبقہ کی تنقید اور مشورے ان کے لئے بڑے منفعت بخش ثابت ہوتے۔

پاکستان کا آئین کیسا ہونا چاہیئے۔ اس کیلئے طلوع اسلام کے صفحات پر اتنا کچھ اور اتنی بار لکھا جا چکا ہے کہ ان تفصیلات میں جانے کی مزید ضرورت نہیں۔ اس آئین کے بنیادی خطوط کو ہم نے اگست ۱۹۶۹ء کے شمارے میں بھی شائع کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے اس موضوع پر انگریزی زبان میں ایک پمفلٹ بھی شائع کیا تھا جس کی عام اشاعت کی گئی ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ پارلیمان کی تشکیل کے بعد اس پمفلٹ کی کاپیاں اراکین پارلیمان تک بھی پہنچا دی جائیں۔ تاکہ وہ بھی اس سے ضروری راہ نمائی حاصل کر سکیں۔ اس اثنا میں مناسب سمجھا گیا ہے کہ ہمارے مجوزہ آئین کے نمایاں خط و خال، ضروری تشریحات کے ساتھ قارئین کی تجدید یادداشت کی غرض سے ایک بار پھر سامنے لے آئے جائیں۔

یہ غنیمت ہے کہ قوم نے ابھی تک اس دعوے سے (کم از کم قولی حیثیت سے) انحراف نہیں برتا کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ اور اس میں اسلامی آئین و قوانین کا نفاذ ہوگا، لیکن قوم کے اس ایفائے عہد کے باوجود، اسلام کے اجارہ داروں نے دانستہ اور ارادۃً ایسی صورت پیدا کر رکھی ہے کہ یہاں اسلامی قوانین رائج ہو ہی نہ سکیں۔ وہ زور دیتے چلے آ رہے ہیں۔ کہ آئین میں یہ شق سر فہرست رکھی جائے کہ ملک کا کوئی قانون "کتاب و سنت" کے خلاف نہیں ہوگا۔ حالانکہ انہیں خود اعتراف ہے کہ "کتاب و سنت کے مطابق کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا۔ جس پر مسلمانوں کے تمام فرقے متفق ہو سکیں" (مودودی صاحب) اس حقیقت کے اعتراف کے بعد آئین میں اس شق کے داخل کرنے پر زور دینا اس مملکت اور اسلام کے خلاف سازش نہیں تو اور کیا ہے؟ ۔ یہ مملکت عملاً اسلامی صرف اس صورت میں بن سکتی ہے، جب اس کا آئینی تقاضا یہ ہو۔ کہ ملک میں قرآنی قوانین و اصول حیات کا نفاذ ہوگا۔ لیکن مذہب کا اجارہ دار طبقہ جو یہاں تھیاکریسی قائم کرنے کی فکر میں ہے اس کی مخالفت کرے گا۔ اور پروپیگنڈہ کی غرض سے مشہور یہ کریگا۔ کہ یہ "انکار حدیث" ہے (جیسا کہ یہ گذشتہ بیس سال

سے کرتا چلا آرہا ہے)۔ اس مقام پر قوم کے سامنے دو ہی راستے کھلے ہوں گے، یا تو وہ ہمت کر کے مذہبی پیشوائیت کے علی الرغم قرآن مجید کو قانون کی اساس قرار دے، اور اگر وہ ایسا کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتی تو پھر اس کا اقرار کرے کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ نہیں ہو سکتے۔ ایک ناممکن العمل شق کو تبرکاً داخل آئین کر کے اپنے آپ کو دھوکا دینے اور دنیا کی نگاہوں میں اسلام کا مذاق اڑانے سے کیا حاصل؟

۲۔ قرآن کی رو سے، مغربی نظام جمہوریت خلاف اسلام ہے۔ اس نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں، جن کے نمائندے قوانین سازی کا کلی اور آخری اختیار رکھتے ہیں۔ قرآن کی رو سے، اقتدار کا سرچشمہ صرف خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا محسوس ذریعہ اس کی کتاب قرآن مجید کی اطاعت ہے۔ اس تصور کی رو سے، مجلس قوانین ساز قرآن مجید کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی کوئی قانون وضع کر سکتی ہے۔ جہاں کوئی قانون قرآن کی حدود سے ٹکرایا، وہ خلاف اسلام، لہٰذا اسلامی مملکت میں خلاف آئین قرار پایا۔ اگر پاکستان کو اسلامی مملکت بننا ہے تو اس میں پارلیمان کی حیثیت صرف اتنی ہوگی۔

یہ دیکھنے کے لئے کہ موجودہ قوانین میں سے کون کون سے قرآن کے خلاف ہیں اور آئندہ بھی جو قانون زیر نظر ہو، وہ خلاف قرآن تو نہیں، ایک مستقل لا کمیشن کا تعین ضروری ہوگا۔

اس امر کا فیصلہ کہ فلاں قانون قرآن کے مطابق ہے یا نہیں، مملکت کی عدالت عالیہ کریگی۔

۳۔ مملکت کے تمام قوانین کا تمام مسلمانوں پر (خواہ وہ کسی فرقے سے متعلق ہوں) یکساں طور پر اطلاق ہوگا۔ اسلام کی بنیاد وحدت ملت اور وحدت قانون پر ہے۔ امت میں مختلف فرقے، اور ہر فرقہ کے لئے الگ الگ قانون خلاف اسلام (اور بنص صریح شرک ہے) اس میں پبلک اور پرسنل لاز کی بھی کوئی تفریق و تخصیص نہیں۔

(۴) قرآن کریم کی رو سے، قومیت کا معیار دین کا اشتراک ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی غیر مسلم، مسلم قومیت کا فرد نہیں ہو سکتا۔ اس ابدی صداقت کو دو قومی نظریہ کہتے ہیں جو ہمارے مطالبۂ پاکستان کی اصل و بنیاد تھا۔ اسی نظریہ کی رو سے، پاکستان میں بسنے والے غیر مسلم، مسلم قوم کا جزو نہیں قرار پا سکتے۔ اس لئے انہیں امور مملکت میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ نہ وہ اسکی پارلیمان کے ممبر بن سکتے ہیں نہ ہی مسلمان اراکین کے انتخاب کے لئے ووٹ دے سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ مملکت کی ان اسامیوں پر بھی تعینات نہیں کئے جا سکتے جن کا تعلق رموز مملکت سے ہو۔ اس مملکت میں انہیں دیگر بنیادی حقوق انسانیت حاصل ہونگے اور انہیں ان کے مذہب کی بھی آزادی ہوگی جو امور سیاست میں دخل انداز نہیں ہو سکیگا۔ وہ اپنے لئے شخصی قوانین خود وضع کرینگے جس کے لئے حکومت پاکستان، ان کے مشورے سے الگ مشینری متعین کریگی۔

(۵) مملکت کا بنیادی فریضہ نظام عدل قائم کرنا ہے۔ موجودہ نظام میں جس طرح عدل کی مٹی پلید ہوتی ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ علاوہ اس کے کہ حصول عدل کس قدر گراں ہو گیا ہے، اور اس کے لئے لوگوں کو کیا کیا حربے اختیار کرنے پڑتے ہیں، مقدمات کے تصفیہ میں جو ناقابل تصور تاخیر ہوتی ہے اس سے عدل کا مفہوم ہی ختم ہو جاتا ہے (انہی دنوں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ ایک لاہور کی عدالتوں میں قریب (۷۰) ہزار مقدمات فیصلہ طلب پڑے ہیں اور ان میں ایسے بھی ہیں جو دس دس، پندرہ پندرہ سال سے زیر سماعت چلے آرہے ہیں)۔ عدل کے لئے ضروری ہے کہ وہ مفت ملے اور بلا تاخیر ملے۔

عدل کے سلسلہ میں ایک اور بنیادی نقطہ بھی غور طلب ہے۔ ملک میں ہزارہا قوانین رائج ہیں۔ ملک کی آبادی کا قریب اسی فیصد حصہ ناخواندہ ہے اور جنہیں خواندہ کہا جاتا ہے ان میں سے شاید ایک فیصد لوگ بھی ایسے نہیں ہونگے جو قانون کی زبان بھی سمجھتے ہوں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لوگ قانون سے کس قدر باخبر ہو سکتے ہیں۔ عملی حالت تو یہ ہے اور قانون کا اساسی فریضہ یہ کہ "قانون سے ناواقفیت کسی خلاف قانون عمل کے لئے معذرت تسلیم نہیں کی جا سکتی ہے" سوچئے کہ کیا یہ صورتِ حالات ایسی نہیں جس پر انسان ماتم کرے۔ مملکت کے لئے ضروری ہے کہ کوئی ایسی مشینری وضع کرے جس کا فریضہ ملک کی آبادی کو قانون سے باخبر کرنا ہو۔ اگر ایسا ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ لوگوں کو حصول عدل میں آسانی ہو جائے گی بلکہ خود مقدمات کی تعداد میں بھی معتد بہ کمی ہو جائے گی۔

(۶) سب سے اہم مسئلہ معاش کا ہے جس نے ایک دنیا کو پاگل کر رکھا ہے، اور جو اب خود ہمارے ہاں اس قدر شدت اختیار کر رہا ہے کہ اگر اسے بلا مزید تاخیر حل نہ کیا گیا تو معلوم یہ کیا شکل اختیار کر جائے۔ اسلامی مملکت میں، افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کا بہم پہنچانا مملکت کا فریضہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی افراد مملکت کا فریضہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اپنی استعداد کے مطابق پوری پوری محنت اور جانفشانی سے کام کریں۔ بالفاظِ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرہ کے کاسب افراد کے لئے کام بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت کی ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو معاش کے مسئلہ کی اصل لم یہی ہے۔ ہمارے ہاں اس کی شدت کے معنی بھی یہی ہیں کہ ملک میں بیکاروں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اس میں تعلیم یافتہ طبقہ خصوصیت سے سخت ضیق میں ہے۔ کس قدر قیامت ہے کہ طالب علم جب تک کالج میں رہتا ہے، ڈیڑھ دو سو روپیہ ماہوار خرچ کرتا ہے اور جب وہ خیر سے فارغ التحصیل ہو کر باہر نکلتا ہے تو سو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کی ملازمت کے لئے دربدر مارا مارا پھرتا ہے۔ بیکاروں اور مایوسوں کا یہی وہ غول ہے جو ہر ہنگامے میں پیش پیش ہوتا ہے۔ اس کے دل میں معاشرہ کے خلاف سخت انتقام کے جذبات موجزن ہوتے ہیں۔ بیروزگاری کا مسئلہ ایسا نہیں جس کا حل ایمپلائمنٹ ایکسچینج کا قیام سمجھ کر حکومت اطمینان سے بیٹھ جائے۔ یہ بڑا گہرا سوال ہے جسے آئینی سطح پر حل کرنا ضروری ہے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ آئین کے ماتحت، ایک "افرادی قوت کا کمیشن" (MAN-POWER COMMISSION) مستقل طور پر مقرر کیا جائے جو اس مسئلہ کے حل کے لئے عملی اقدامات کرے۔ وہ ہر کاسب فرد معاشرہ کو مناسب کام مہیا کرے اور جس کے لئے کام مہیا نہ کر سکے اس کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کا انتظام کرے۔

(۷) لیکن صرف کام مہیا کر دینا ہی کافی نہیں، اس کے ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہوگا کہ اشیائے ضروریہ کی قیمتیں اس طرح آسمان کی طرف نہ اٹھتی جائیں جس طرح آجکل ہو رہا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ اگر کوئی شخص کسی صاحب احتیاج کی ضرورتمندی سے فائدہ اٹھا کر، اسے سو روپیہ قرض دے کر ایک سو دس روپے وصول کرے، تو اُسے سود قرار دے کر اس کے خلاف کفر کا فتویٰ بھی صادر کر دیا جائے اور معاشرہ اسے سود خوار پکار کر نفرت کی نگاہ سے بھی دیکھے۔ لیکن اگر دوسرا شخص (صنعت کار) سو روپے کی دوائیاں بنا کر انہیں پانچسو روپے میں دکاندار کے پاس بیچے اور دکاندار بھی اس پر پچاس فیصد منافع وصول کرے تو اسے نہ کوئی حرام قرار دے نہ باعثِ ندامت۔ پھر سود خوار کے خلاف تو حکومت قانون وضع اور نافذ کرے لیکن صنعت کار اور تاجر کو ہر قسم کی سہولت اور تحفظ بہم پہنچائے۔ لہٰذا آئین کے تابع ایک مستقل کمیشن اس مقصد کے لئے بھی ہونا چاہیئے جو اشیائے صرف کی قیمتوں پر کنٹرول رکھے۔ قرآن کریم نے ربٰو ہی کو حرام نہیں قرار دیا۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ ۔۔۔ لَا

تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ (۲۶/۱۸۳) آجکل کی اصطلاح میں اسے یوں کہیں گے۔ کہ خریدار کے روپے کی قیمت کو روز بروز کم نہ کرتے جاؤ۔ اشیا کی قیمتوں میں بے محابا اضافہ کے معنی یہ ہیں کہ صارفین کے روپے کی قیمت میں کمی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ جو چیز پہلے ایک روپے کی مل جاتی تھی، اب وہ پانچ روپے کی بھی نہیں ملتی، اس کے معنی یہ ہیں کہ خریدار کے روپے کی قیمت، پہلے کے مقابلہ میں پانچواں حصہ (تین آنے کے برابر) رہ گئی ہے۔ یاد رکھئے۔ کسی چیز کی لاگت اور اپنی مزدوری سے زیادہ جو کچھ بھی گاہک سے لیا جائے، وہ تجنیس ہے جس کی قرآن کریم نے اس سختی سے ممانعت کی ہے کہ اس لئے کہا ہے کہ قومیں اس کی وجہ سے تباہ ہو جاتی ہیں۔

(۸) قوم کی تشکیل اور مملکت کے استحکام کا دار و مدار تعلیم پر ہے۔ یوں تو یہ مسئلہ ایسا متفق علیہ اور مسلم ہے کہ اس کے لئے کسی بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں، لیکن اگر کسی نے غلط تعلیم کے تباہ کن نتائج کا مشاہدہ کرنا ہو، تو اس کے لئے مشرقی پاکستان کے حالیہ واقعات کھلی ہوئی کتاب کی طرح موجود ہیں۔ وہاں یہ ساری قیامت خیزیاں اس لئے ہوئیں کہ ہم نے نہ صرف یہ کہ وہاں کی نئی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ کیا۔ بلکہ انہیں ہندوؤں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا، نتیجہ یہ کہ ان کا صحیح معنوں میں مسلمان بننا تو ایک طرف، وہ پاکستانی بھی نہ بن سکے، مشرقی پاکستان میں تو آتش گیر مادہ کو فلیتہ دکھا دیا گیا۔ اس لئے وہ بھڑک اٹھا۔ خود مغربی پاکستان میں بھی کیفیت کچھ اس سے مختلف نہیں، یہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی نظریۂ پاکستان سے اسی طرح بیگانہ اور مذہب سے اسی طرح سرکش اور متنفر ہے۔ یہ نسل تو جو کچھ بننی تھی، بن گئی لیکن اگر اس مملکت کو بچانا مقصود ہے، تو ہمیں کم از کم اپنی آنے والی نسلوں ہی کو سنبھال لینا چاہیئے۔ یاد رکھئے کہ صحیح تعلیم کا معیار یہ ہے کہ طالب علم کے دل و دماغ میں مستقل اقدار خداوندی کی اہمیت پوری طرح جاگزیں ہو۔ اور علوم حاضرہ میں سے اسے جو کچھ بھی پڑھایا جائے۔ اس میں ایسی بصیرت پیدا ہو جائے، کہ وہ فیصلہ کر سکے، کہ اس میں کون سی بات اُن اقدار کے خلاف ہے، اگر ایسا کر لیا گیا تو اس مملکت کے باقی رہ جانے اور مخالفتوں کا مقابلہ کرنے کا امکان ہو سکتا ہے۔

تعلیم کے ساتھ ان نوجوانوں کی سیرت و کردار پر نگاہ رکھنی بھی ضروری ہو گی۔ امتحان میں کامیابی کے لئے اسے ایک "لازمی مضمون" کی حیثیت دینی چاہیئے، اور اسے آئین میں شامل کرنا چاہیئے۔

سیرت و کردار کی نگہ و پرداخت طالب علمی کے زمانہ تک ہی محدود نہیں رکھنی چاہیئے، اسے حصول ملازمت کے لئے بھی لازمی شرط قرار دینا چاہیئے۔ اور ملازمت کے دوران بھی اسے ملازمت بحال رکھنے کی بنیادی شرط سمجھنا چاہیئے۔ یہ شرط عمال حکومت تک ہی محدود نہیں ہونی چاہیئے، بلکہ پارلیمان کے اراکین، وزراء، حکومت کے مشیر اور سفیر، بلکہ ان سب سے بڑھ کر وزیر اعظم اور صدر مملکت کی اہلیت کے لئے بھی اسے بنیادی معیار قرار دینا چاہیئے۔ اس شرط کو آئینی حیثیت دینی ضروری ہے۔

(۹) جہاں تک نظام حکومت کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ اسے اصولاً ایسا ہونا چاہیئے، جس سے مملکت قائم ہے، مستحکم ہوتی چلی جائے، اور اس کا ہر قدم اس نصب العین کی طرف اٹھے جس کے لئے وہ وجود میں آئی ہے۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ ایک مملکت اس وقت تک مملکت کہلا سکتی ہے جب تک وہ ایک ناقابل تقسیم وحدت (INDIVISIBLE UNIT) ہو۔ اگر اسے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جائے، اور ہر حصہ میں ایسا نظام حکومت رائج ہو جس سے اس کی حیثیت کم و بیش خود ایک مملکت کی سی ہو جائے۔ تو اصل مملکت کا وجود اگلے خطرہ میں پڑ جائے گا۔ اور رفتہ رفتہ مٹ ہی جائے گا۔ اس بنیادی حقیقت کا اطلاق دنیا کی ہر مملکت پر ہوتا ہے۔ لیکن مملکت پاکستان کی سالمیت

کے لئے اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوجاتی ہے۔ اس لئے کہ (۱) اس کے دونوں بازوؤں میں جغرافیائی بُعد بہت زیادہ ہے۔ (۲) یہاں کے باشندے، نسلی اور لسانی تفریقات کی بنا پر اس طرح مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ کہ ان میں سے ہر طبقہ اپنے آپ کو ایک جداگانہ قوم سمجھتا ہے۔ اور (۳) ہم نے ان افراد کو ایک قوم میں تبدیل کرنے کے لئے آج تک کچھ نہیں کیا۔ بنا بریں یہاں صوبجاتی خودمختاری مملکت کے وجود کلی کے لئے بڑی نقصان رساں ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری شروع سے یہ تجویز رہی ہے کہ پاکستان میں وحدانی انداز (UNITARY FORM) کی حکومت قائم ہونی چاہیئے، جس میں مختلف علاقوں کی آبادی کی کوئی تخصیص نہ ہو۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو مغربی اور مشرقی حصوں کو دو وحدتیں تسلیم کرکے ان میں ایسی حکومتیں قائم کی جائیں جو ایک مضبوط مرکز کے تابع ہوں، اور مرکز دو ایوانوں پر مشتمل ہو — ایوان زیریں عام ابنائے ملت پر مشتمل اور ایوان بالا خاص اہلیت اور صلاحیت کے ارباب قوم پر۔ اس ایوان میں نمائندگی دونوں بازوؤں کی مساوی ہو۔ اور امور مملکت میں قولِ فیصل اسی کا ہو۔

(۱۰) جمہوری نظام میں وہ چٹان ... جس سے ٹکرا کر اس کی کشتی پاش پاش ہوجاتی ہے، یہ سوال ہے کہ جب پورے کے پورے نظام میں ابتری پھیل جائے تو اس وقت کیا کیا جائے۔ پارلیمانی نظام میں جب برسراقتدار پارٹی اپنا اعتماد کھو دے تو مخالف پارٹی، عدم اعتماد کی قرارداد سے اسے برطرف کرسکتی ہے۔ معاملہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتے تو سربراہ مملکت، زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے، لیکن جب سربراہ مملکت سمیت، آوے کا آوا ہی بگڑ جائے، تو موجودہ صورت میں، اس وقت ایک ہی چارہ کار باقی رہ جاتا ہے کہ فوج مداخلت کرکے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے، اس سے ملک کے آئین و قوانین کی بساط لپیٹ دی جاتی ہے، اور مارشل لاء نافذ ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ شکل اس لئے (با مجبوری) اختیار کرنی پڑتی ہے کہ آئین میں ایسے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کوئی شق موجود نہیں ہوتی، ہماری تجویز یہ ہے کہ آئین کی رو سے ملک میں ایک ایسی نگران کونسل مقرر کردی جائے، جو (مثلاً) مختلف (صوبائی اور مرکزی) اسمبلیوں کے سپیکرز، ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ کے چیف ججوں اور فوج کے تینوں شعبوں کے سربراہوں پر مشتمل ہو۔ اگر وہ دیکھے کہ اس وقت کا نظام امور مملکت کی سرانجام دہی کا اہل نہیں رہا تو وہ اسے برطرف کرکے زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے، اور ایک معینہ مدت کے اندر نئے انتخابات کی رو سے، ایک جدید نظام متشکل کرکے اختیارات اسے لوٹا دے۔ اس سے ملک روز روز کی بے آئینی سے بھی محفوظ رہ سکے گا اور اس کے پیدا کردہ اضطراب اور خلفشار سے بھی مامون۔ یہ اس تجویز کے بنیادی خط وخال ہیں جن میں مزید غور سے مناسب ترمیم کی جاسکتی ہے آئین میں بہرحال اس قسم کی کسی متبادل شکل کا موجود ہونا نہایت ضروری ہے۔

(۱۱) بنیادی حقوق انسانیت کا تصور اب اس قدر عالمگیر اور مسلّم ہوچکا ہے کہ اس سلسلہ میں کسی بحث کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن یہ عجیب تماشا ہے کہ جہاں نظری طور پر ان حقوق کو اس قدر مسلّم اور ناقابل انکار تصور کیا جاتا ہے، عملاً ان کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہتا۔ یہ اس لئے کہ ہر حق کے ساتھ یہ پخ لگا دی جاتی ہے کہ یہ اس صورت میں حاصل ہوسکے گا کہ اس سے مفادِ عامہ (PUBLIC INTEREST) یا مملکت (STATE) کے مقاصد پر کوئی زد نہ پڑتی ہو۔ "پبلک انٹرسٹ" یا "مملکت کے مقاصد" ایسی مبہم اصطلاحات ہیں جن کا کوئی مفہوم متعین نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ "پبلک کا مفاد" یا "اسٹیٹ کے مقاصد" کے الفاظ تو ایک طرف، خود "پبلک" اور "اسٹیٹ" کے تصورات بھی کچھ ایسے تجریدی (ABSTRACT) بنا دیئے گئے ہیں کہ ان کا کوئی محسوس پیکر سامنے نہیں آتا (مثلاً) جب یہ کہا جاتا ہے کہ مملکت پاکستان کی پالیسی یہ ہے کہ ....

تو آپ کے ذہن میں کبھی یہ نہیں آسکے گا کہ یہ پالیسی کس کی ہے؟ تصوراتی اعتبار سے تو مملکت (سٹیٹ) کا مفہوم ایسا عظیم اور رفیع بلکہ مقدس ہوگا کہ وہ "برتر از قیاس وخیال وگمان ووہم" نظر آئے گا۔ لیکن جب آپ اسے سمٹائیں گے۔ تو وہ آخرالامر دو چار اشخاص (بلکہ بعض اوقات صرف کسی ایک شخص) کی ذات میں محدود ہو کر رہ جائے گا۔ لہٰذا، مملکت کی پالیسی سے عملاً مراد ہوگی ان اشخاص (یا ایک شخص) کا طے کردہ فیصلہ۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جب یہ کہا جائے کہ فلاں بنیادی حق ہر فردِ معاشرہ کو حاصل ہوگا۔ بشرطیکہ وہ مملکت کی کسی پالیسی سے ٹکرائے نہیں تو اس کا عملی مفہوم یہ ہوگا کہ "بشرطیکہ ایسا کرنا ان دو چار اشخاص (یا ایک شخص) کی منشاء کے خلاف نہ ہو۔" قرآن کریم نے جہاں اہم اور بنیادی حقوقِ انسانیت کی تفصیل دی ہے، اس کے ساتھ ان حدود و شرائط کی بھی وضاحت کر دی ہے جن سے وہ مشروط ہیں۔ یا جن کے تحت کسی کو ان سے محروم کیا جاسکتا ہے۔ اس وضاحت کے بعد تمام افرادِ معاشرہ کو حتمی طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے بنیادی حقوق کیا ہیں۔ اور وہ کن حالات میں سلب کئے جاسکتے ہیں۔ اس سے انہیں جس قدر اطمینان اور سکون حاصل ہوسکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ قرآن یہ تو یہ کرتا کہ ایک ہاتھ سے، حقوقِ انسانیت کی نہایت درخشندہ وتابندہ فہرست عطا کرائے، اور دوسرے ہاتھ سے انہیں پبلک انٹرسٹ اور مملکت کے غیر واضح اور غیر متعین مقاصد کے پردے میں واپس لے لے۔ بنیادی حقوق کے معاملہ میں جب تک ان امور کی وضاحت نہیں ہوگی جن کے تحت انہیں سلب کیا جاسکتا ہے، کسی کو ان کی لمبی چوڑی فہرست سے کسی قسم کا اطمینان حاصل نہیں ہوگا۔ آئین میں اس کی تصریح ہونی ضروری ہے تاکہ مملکت فاشسٹ نہ بن سکے،

(۲) بنیادی حقوق میں سرِ فہرست اس امر کو ہونا چاہیئے کہ مملکت میں قرآنی تعلیم کی نشر و اشاعت کا حق ہر ایک کو حاصل ہوگا۔ آپ شاید اس پر متعجب ہوں کہ ہم نے یہ کیا مطالبہ پیش کر دیا۔ کیونکہ آپ کے ذہن میں ہوگا کہ اس کی آزادی تو آج بھی ہر ایک کو حاصل ہے، لیکن آپ کو غالباً اس کا علم نہیں کہ یہاں (بلکہ تمام مسلم ممالک میں) سب سے زیادہ پابندی خالص قرآنی فکر کی نشر و اشاعت پر عائد ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ

(۱) عوام مذہبی پیشوائیت کے زیرِ اثر ہیں۔

(۲) مذہبی پیشوائیت قرآن خالص کی تعلیم کے عام ہونے کو کبھی گوارا نہیں کرسکتی، اس لئے وہ ہر اس آواز کو دبانے کی کوشش کرتی ہے، جو اس فکر و تعلیم کو عام کرنے کے لئے بلند کی جائے۔ وہ اس آواز کے خلاف عوام کو بھڑکا دیتے ہیں؛ اور — (۳) حکومت عوام کے اشتعال سے خائف ہوتی ہے، اس لئے وہ قرآنی فکر کو اسی حد تک عام ہونے کی اجازت دیتی ہے، جس حد تک وہ مذہبی پیشوائیت کو گوارا ہو۔ اور مذہبی پیشوائیت میں ہر فرقہ شامل ہوتا ہے۔

مملکت میں قرآن پر مبنی آئین وقوانین اسی صورت میں نافذ ہوسکتے ہیں، جب ملک میں قرآن خالص کی تعلیم کو عام کیا جائے۔ "قرآن خالص" سے مراد ہے وہ فکر اور تعلیم جس کی سند قرآن کریم سے پیش کی جائے۔

خدا کرے کہ اب حالات ایسے ساعد رہیں کہ صدر کے اعلان کردہ پروگرام کے مطابق پارلیمان کی تشکیل ہو جائے۔ اور اس لابد نصیب ملک کو کوئی قابلِ عمل آئین مل جائے۔ ہم نے "خدا کرے" اس لئے کہا ہے کہ مشرقی پاکستان سے جو اطلاعات موصول ہو رہی ہیں ان سے مترشح ہوتا ہے کہ وہاں ابھی تک حالات معمول پر نہیں آئے۔ پہلے وہاں (کالعدم) عوامی لیگ کے شرپسند فساد برپا کیا کرتے تھے، اب جماعتِ اسلامی کے رضاکار من مانی کر رہے ہیں۔

(۳)

علامہ اقبالؔ نے کہا تھا کہ — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی — "دین" سے مراد ہے مستقل اقدارِ خداوندی

جو کسی فرد، جماعت، پارٹی، گروہ یا قوم کی مصلحت کوشیوں کے مطابق بدلتی نہ رہیں، وہ غیر متبدل رہیں اور ان کا اطلاق تمام انسانیت پر یکساں ہو۔ یوں تو انسانی تاریخ میں سیاست کو بالعموم دین سے الگ رکھا گیا ہے کہ مفاد پرست گروہ اسی میں اپنا فائدہ دیکھتے ہیں لیکن عصر حاضر کی سیاست اس درجہ بیباک ہو گئی ہے کہ آج دنیا میں کوئی مملکت ایسی نہیں جس میں کوئی مستقل قدر بھی غیر متبدل اور حالگیر حیثیت سے کارفرما ہو۔ اس کی بین شہادت ہماری ہمسایہ مملکت (ہندوستان) کی سیاست، اور اس کے ہمنواؤں کے مسلک سے بآسانی مل سکتی ہے۔ آپ گزشتہ تیئیس برس کے صرف نظر کرتے ہوئے واقعات کو لیجئے۔ حکومت ہند نے، پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی غرض سے، نہایت گہری سازش کے ماتحت، پاکستان کے ملت فروش غداروں کے ایک گروہ کو اپنے ساتھ ملایا۔ اپنے مسلح تخریب کاروں کو مشرقی پاکستان میں مسلسل بھیجا گیا۔ یہ سلسلہ مہینوں تک جاری رہا تا آنکہ ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد اسی سازش کے ماتحت وہاں اعلانیہ بغاوت کرائی گئی۔ اس سرزمین میں کشت وخون، لوٹ مار، آتش زنی، تخریب کاری، عصمت دری، ہنگامہ انگیزی اس وسیع اور شدید پیمانے پر کرائی گئی جس کی مثال تاریخ میں کم ملے گی۔ پاکستانی افواج کی جانفشانیوں سے بغاوت فرو ہوئی تو "پناہ گزینوں" کے مسئلہ کو لے کر بیٹھ گئے اور ان کے راستے میں ایسی رکاوٹیں پیدا کیں کہ وہ پاکستان واپس آ ہی نہ سکیں۔ اسکے ساتھ ہی، (بلا اعلان جنگ) وہاں جنگ کی سی ایسی حالت پیدا کر رکھی ہے کہ وہاں کے سرحدی دیہات پر ہر روز فوجی حملے کئے جاتے ہیں جن سے سینکڑوں بے گناہ جانیں تلف ہوتی ہیں۔ ادھر پاکستان کے پورے کے پورے بارڈر پر لاکھوں کی تعداد میں اپنی فوجیں، سامان حرب وضرب سمیت مسلط کر رکھی ہیں۔ یہ سب کچھ کرنے کے ساتھ ساتھ، ساری دنیا کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ ہم (بھارتی) بیحد مظلوم ہیں۔ پاکستان زیادتیاں کئے جا رہا ہے۔ ہم ان کی جارحانہ کارروائیوں کو مسلسل برداشت کئے جا رہے ہیں۔ پناہ گزینوں سے متعلق اخراجات نے ہماری کمر توڑ رکھی ہے۔ پاکستان انہیں واپس نہیں لینا چاہتا۔ وہ ہندوستان پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ یہ جھوٹ مہینوں سے مسلسل بولا جا رہا ہے۔ پاکستان ہر موقعہ اور مقام پر اس کی تردید کرتا ہے لیکن ان کی بے شرمی اور بے حیائی کی حد ہے کہ وہ اس کے باوجود مسلسل جھوٹ بولے جا رہے ہیں۔

یہ تو ہے ہندوستان کی سیاست۔ اب باقی ممالک کو لیجئے۔ آپ سوچئے کہ کیا آجکل کی دنیا میں، یورپ، امریکہ وغیرہ کا کوئی ملک بھی ایسا ہو سکتا ہے جسے اس کا علم نہ ہو کہ اصل واقعات کیا ہیں اور ہندوستان کس قدر غلط بیانی اور فریب انگیزی سے کام لے رہا ہے؟ انہیں ہر بات کا علم ہے لیکن اس کے باوجود بعض ممالک علانیہ بھارت کو برسر حق اور پاکستان کو مجرم قرار دیئے جا رہے ہیں اور جو کھل کر ایسا نہیں کرتے وہ بھی اتنا ہی کہتے ہیں کہ یہ پاکستان کا اندرونی معاملہ ہے۔ یعنی ہندوستان کو (بجز ایک آدھ) کوئی ملک بھی مورد الزام نہیں ٹھہراتا۔ ان بڑی طاقتوں کی سازش یہ ہوتی ہے کہ چھوٹے ملکوں کے حالات میں ایسی نزاکت پیدا کر دی جائے کہ وہ برسر حق ہونے کے باوجود، اپنی مدافعت پر اتر آئیں اور ان طاقتوں کو آواز دینے پر مجبور ہو جائیں کہ خدا کے لئے مفاہمت کی کوئی صورت پیدا کرا دیجئے۔ اس وقت وہ کرسئ عدالت پر براجمان ہو کر، فریقین کو اپنے حضور طلب فرما لیتے ہیں اور انہیں ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتے ہیں اور اس کے بعد ایسا فیصلہ دے دیتے ہیں جس سے مظلوم بچارا پہلے سے بھی زیادہ مظلوم ہو جائے، لیکن اس کے باوجود ان کا شکریہ ادا کرے کہ انہوں نے حالات کی نزاکت کو سنبھالنے میں اس قدر غریب پروری اور عدل گستری سے کام لیا۔

ہمارے ساتھ شروع ہی سے ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے اور اب بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ہم رفتہ رفتہ اس مقام تک

پہنچا دیئے گئے ہیں جہاں ہم برسرِ حق ہونے کے باوجود دنیا کی بڑی طاقتوں کیطرف ملتجیانہ نگاہوں سے تک رہے ہیں کہ کوئی آگے بڑھ کر ہمیں اس کشمکش سے نجات دلائے۔ اگر ایسا ہوا تو نظر آتا ہے کہ اس مرتبہ ہندو ہمارے ساتھ برابر کی سطح پر ملزم کی حیثیت سے کھڑا نہیں ہوگا بلکہ فریقِ غالب کی حیثیت سے اپنی شرائط منوائیگا۔

لیکن اس صورتِ حالات کے ذمہ دار ہم خود ہیں، کوئی اور نہیں۔ ہندوستان ہمارا کھلا ہوا دشمن ہے اس لئے وہ ہماری تخریب کے لئے آخری دم تک ہر ممکن حربہ استعمال کریگا۔ لیکن وہ دن بدن ہمارے سر پر اس لئے چڑھتا جا رہا ہے کہ ہم نے اپنے ہاتھوں اپنے حالات کو اس حد تک خراب کر لیا ہے۔ یہ غنیمت ہے کہ ہماری افواج قاہرہ (بفضلِ ایزدی) ابھی تک ان حالات سے متاثر نہیں ہوئیں اور دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے چٹان کیطرح کھڑی ہیں۔ لیکن تو میں تنہا فوجوں کے سہارے تو زندہ نہیں رہا کرتیں۔ وہ زندہ رہتی ہیں اپنی خود فراموشی کی بیداری سے۔ اور اس کے لئے یہاں کچھ نہیں ہو رہا۔ اس کا ذریعہ تھا صحیح نظامِ تعلیم جس کی طرف کسی کی نگاہ نہیں اٹھتی۔ اور غلط تعلیم نے جس قسم کا نوجوان پیدا کر دیا ہے وہ اپنی شہادت آپ بن کر سامنے آ رہا ہے۔

ہم نے ستمبر ۱۹۷۱ء کے طلوعِ اسلام میں لکھا تھا کہ ملک میں ایک اور خطرہ ایسا نمودار ہو رہا ہے جو مجیب کے خطرے سے کہیں زیادہ مہیب اور تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے، اور یہ خطرہ ہے جماعت اسلامی کے نئے عزائم کا جس کی ابتدا انہوں نے مشرقی پاکستان میں کر دی ہے۔ اس جماعت کا مسلک جس کا اعلان انہوں نے سالہا سال پہلے کر دیا تھا، یہ ہے کہ جب جماعت اچھی طرح منظم ہو جائے تو پھر بزورِ شمشیر اقتدار پر قبضہ کر لیا جائے۔ اس تمام عرصہ میں انہوں نے اپنی تنظیم تو اچھی خاصی کر لی لیکن "شمشیر" انہیں میسر نہ آ سکی۔ اب مشرقی پاکستان میں انہیں یہ بھی مہیا ہو رہی ہے۔ اس جماعت کے مسلح رضاکاروں کے متعلق جو کچھ جستہ جستہ اخبارات میں آ رہا ہے، اس سے ان کے عزائم اور اقدامات کا کچھ کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کی تخریبی کارروائیوں کا مؤثر ترین ذریعہ طالب علموں کی بے سری فوج ہوتی ہے اور اب یہ اطلاعات موصول ہو رہی ہیں کہ مشرقی پاکستان میں اسلامی جمعیت الطلبا نے اپنی مختص فوجی تنظیم قائم کر لی ہے جسے البدر کہا جاتا ہے۔ اس جماعت کے مؤید ہفت روزہ زندگی کی اشاعت بابت ۱۱ تا ۱۷ اکتوبر میں اس جمعیت کے بیسویں سالانہ اجتماع کی روئداد شائع ہوئی ہے جو حال ہی میں ملتان میں منعقد ہوا ہے۔ اس میں البدر کے متعلق کچھ معلومات، خود اس تنظیم سے متعلق طلبا کی زبانی سامنے آئی ہیں جو سننے اور غور کرنے کے قابل ہیں۔ اس میں لکھا ہے۔

> البدر کے کمانڈر اشرف چھریرے بدن کا بڑا ہی ہنس مکھ نوجوان ہے اور بالکل کھرے اور سیدھے انداز میں بات کرتا ہے۔ کہنے لگا۔ "مغربی پاکستان میں البدر کے بارے میں بڑی غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں۔ ہزاروی جمعیت اور بھٹو والے یہاں کہتے پھرتے ہیں کہ ہم مسلح ہو کر وہاں ترقی پسند عناصر کا صفایا کر رہے ہیں۔ بھائی کونسے ترقی پسند اور کیسے سوشلسٹ؟ وہ وہاں موجود ہوں تو ہم ان کا صفایا کریں۔ وہ تو سب کلکتہ فرار ہو گئے۔ ہم وہاں وطن دشمنوں کے خلاف اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھے بیٹھے ہیں" اور یہاں بھٹو صاحب کو بیان بازی سوجھی ہے۔

یعنی اس وقت وہاں ترقی پسند عناصر موجود نہیں۔ وہ وہاں موجود ہونگے تو یہ ضرور ان کا صفایا کر دیں گے۔ سبحان اللہ

یہ لوگ "وطن دشمن عناصر" کا صفایا کرنے میں مصروف ہیں ۔۔۔ پوچھنے کی بات یہ تھی کہ ان کی نگاہوں میں "وطن دشمن عناصر" کون سے ہیں!

اس کے بعد ان سے سوال کیا گیا کہ "آپ کو رضا کاروں سے الگ ہو کر منظم ہونے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" جواب ملا:۔

> دراصل رضا کاروں میں صرف طالب علم ہی نہیں، دوسرے شہری بھی شامل ہیں۔ ہم الگ رہ کر کام کرنا چاہتے ہیں ..... دوسری بات یہ تھی کہ رضا کار تنظیمیں پولیس اور رینجرز کی ماتحتی میں کام کرتی ہیں اور پولیس اور رینجرز زیادہ تر مغربی پاکستان سے بھیجے گئے ہیں۔

جماعت اسلامی کی اس "ٹیکنیک" کا تو آپ کو علم ہی ہے کہ وہ اپنے ماتحت بے شمار ذیلی تنظیمیں قائم کرتی ہے۔ لیکن عام تاثر یہ دیتی ہے کہ ان کا جماعت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تنظیمیں جماعت کے پروگرام کے مختلف شعبوں کے بروئے کار لانے کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ لیکن ان کے قابلِ اعتراض اقدامات کی ذمہ داری جماعت اپنے سر پر نہیں لیتی۔ اس نے یہی "ٹیکنیک" اب مشرقی پاکستان میں اختیار کر رکھی ہے۔ اس جماعت کا ایک مؤثر عنصر رضا کاروں میں شامل ہے اور دوسرے عنصر (جمعیت الطلبا) نے اپنی الگ عسکری تنظیم قائم کر رکھی ہے۔ اس نکتہ کو فراموش نہ کیجئے کہ یہ فوجی تنظیم پولیس اور رینجرز کی ماتحتی میں کام نہیں کر رہی۔ بالکل آزاد تنظیم ہے۔

اشرف کمانڈر سے پوچھا گیا کہ آپ اتنی اہم جنگ کس طرح سے لڑ رہے ہیں تو انہوں نے کہا کہ

> بھئی! ہمیں بارہ دن کا تربیت دیا جاتا ہے اور پھر ہم میدانِ عمل میں آجاتے ہیں۔ سچی بات ہے اس سے پہلے ہم نے کبھی بندوق نہیں پکڑی تھی۔ مگر اب ہم میں سے ہر ایک اللہ کا سپاہی ہے۔

یہ تو رہا ان کی ٹریننگ کا معاملہ۔ اب ان کا طریق کار بھی سن لیجئے۔ لیکن اسے سننے سے پہلے اس حقیقت کو ذہن میں اجاگر کر لیجئے کہ جماعت اسلامی کے نزدیک، زندگی کی اہم ضروریات کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے اور اپنے مخالف کی ہلاکت کے لئے ہر قسم کا فریب کارانہ حربہ بالکل جائز۔ اب اشرف صاحب کا جواب سنئے۔ انہوں نے کہا:۔

> ابا بھی ہوا ہے کہ ہم جیسے بنگلہ کے حامی بن کر دیہاتوں میں گئے۔ اس طرح تخریب کاروں کے ہمدرد بن کر ان کی شناخت کروائی اور فوج کو انہیں گرفتار کرنے میں مدد دی۔ مگر بعد میں ہمارا یہ داؤ کند ہو گیا اور ہم نے اور طریقے اپنائے جنہیں بہرحال فاش نہیں ہونا چاہیئے۔

انہوں نے یہ بھی کہا کہ:۔

> پچھلے دنوں جنرل نیازی نے میمن سنگھ کا دورہ کیا تو ہماری کارکردگی کی بے پناہ تعریف کی۔

یہ تھیں البدر کے متعلق، اشرف کمانڈر کی بیان کردہ تفصیلات۔ اس کے بعد جمعیت کے منتخب شدہ ناظم اعلیٰ تسنیم عالم منظر صاحب سے جب یہ سوال کیا گیا کہ "ناظم اعلیٰ کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد آپ کے سامنے کام کا کوئی جامع منصوبہ ہے؟" تو انہوں نے کہا کہ

> جی ہاں! بالکل ہے .... سب سے پہلی بات تو یہ کہ مغربی پاکستان میں ہم اپنے کارکنوں کو دیہاتوں میں بھیجیں گے جہاں ابھی کام کی ضرورت ہے۔ ہم اس طرح اپنی تحریک کو پھیلائیں گے۔

یعنی مشرقی پاکستان کے بعد یا اس کے ساتھ ساتھ ان کی سرگرمیوں کی آماجگاہ مغربی پاکستان کی سرزمین بھی بنے گی۔

اس وقت جماعتِ اسلامی کی ان مسلح عسکری سرگرمیوں کے خلاف صرف پیپلز پارٹی نے آواز اٹھائی ہے۔ لیکن چونکہ یہ سمجھا گیا ہے کہ یہ آواز جماعتِ اسلامی کی ایک حریف پارٹی کی طرف سے بلند ہوئی ہے اس لئے اسے چنداں اہمیت نہیں دی گئی۔ ملک کے باقی لیڈر یا تو اس باب میں خاموش ہیں اور یا جی میں خوش کہ اچھا ہے جو پیپلز پارٹی ان کے ہاتھوں پٹ جائے۔ لیکن ہم ان حضرات کے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں کہ انہیں اس پر خوش نہیں ہونا چاہیئے۔ پیپلز پارٹی کے بعد ایک ایک کر کے خود ان کی باری بھی آجائے گی اس لئے کہ جماعتِ اسلامی کے امیر کا یہ فیصلہ ہے کہ جو لوگ اسلامی عقاید و نظریات میں ان کے ہم آہنگ نہیں وہ مرتد ہیں اور شریعت کی رُو سے واجب القتل۔ اس لئے ان حضرات کو سعدی کے الفاظ میں سمن رکھنا چاہیئے کہ

اے دوست! بر جنازۂ دشمن چو بگذری
شادی مکن کہ پاتو چنیں ماجرا رود!

اس کے ساتھ ہی ہم اربابِ حکومت کی خدمت میں بھی باادب گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ اس جماعت کے ہاتھوں میں ہتھیار دے کر وہ ملک کے لئے ایک ایسا خطرہ پیدا کر رہے ہیں جو نتائج کے اعتبار سے مجیب کے خطرہ سے بھی زیادہ مہیب اور تباہ کن ہوگا۔ مجیب کے ہمنوا نسلی تعصب کے نشہ سے مدہوش تھے لیکن جماعتِ اسلامی کے یہ عمال اور رفقاء اپنے آپ کو (کمانڈر اشرف کے الفاظ میں) "اللہ کے سپاہی" تصور کرتے ہیں۔ اس لئے جب یہ مخالفت میں اٹھیں گے تو اپنی اس جنگ کو جہاد فی سبیل اللہ قرار دینگے۔ اور اس کے نتائج واضح ہیں۔ ویسے بھی ایک ایسے ملک میں جس کی عام آبادی غیر مسلح ہو ایک گروہ کو اس طرح مسلح کر دینا قتل و غارت گری کا دروازہ کھول دینا ہے۔ مشرقی پاکستان کے سالقہ رضاکار، ایسٹ پاکستان رائفلز اور ایسٹ بنگال رجمنٹ، فوجی ڈسپلن کے تابع تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے جس انداز سے بغاوت کی اس کی شہادت خود حکومت کے شائع کردہ قرطاس ابیض سے مل جاتی ہے۔ ان کے برعکس (کمانڈر اشرف کے بیان کے مطابق) البدر کی تنظیم پولیس کے ماتحت ہے نہ رینجرز کے۔ اس لئے جس بیباکی اور آزادی سے شمشیر بکف اٹھیں گے اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ کیا اربابِ حکومت ہماری اس عرضداشت کو درخورِ اعتنا قرار دینگے۔

باقی رہی بھارت کی طرف سے جنگ کی دھمکی۔ سو اگر ہماری حکومت نے ان کے جواب میں یا عند الضرورت خود اپنی طرف سے جنگ کا اعلان کیا تو ہمیں یقین ہے کہ قوم کا ایک ایک فرد ۱۹۶۵ء سے بھی زیادہ جذبۂ ایثار کے ساتھ دشمن کو پسپا کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوگا۔ اور بھارت کو ایک بار پھر صدر ایوب کے الفاظ میں اس کا پتہ چل جائے گا کہ اس نے کس قوم کو للکارا ہے۔

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ دو اہم خبریں ہمارے سامنے آئیں۔ پہلی خبر حسب ذیل ہے۔

انجمن مہاجرین مشرقی پاکستان کے صدر دیوان دہاشت حسین نے مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے خطاب کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ یکم مارچ کو قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہونے کے بعد سے ۵ مارچ تک مشرقی پاکستان میں جو ہنگامے، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا اس میں صرف عوامی لیگ کے کارکن اور رضاکاروں ہی نے حصہ نہیں لیا بلکہ جماعت اسلامی

اور مسلم لیگ کے کارکن اور رضاکار بھی اس میں شامل تھے اور انہوں نے مہاجرین کا بے دریغ قتل عام کیا۔ خواتین کی آبرو لوٹی اور مکانوں کو تاراج کیا۔

آگے چلکر انہوں نے کہا کہ "اس لوٹ مار اور آبروریزی کے واقعات میں مسلم لیگ اور جماعت اسلامی سمیت تمام پارٹیوں کے کارکنوں، رہنماؤں اور طلباء کی ذیلی تنظیموں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ .... دیناج پور میں جماعت اسلامی کے مقامی امیر نے مہاجرین کی نشاندہی کر کے انہیں قتل کرایا۔ دیناج پور ہی میں اقبال سکول سے ایک من کے قریب ٹوٹی ہوئی چوڑیاں برآمد ہوئیں۔ جب اس سلسلہ میں تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس سکول کو عورتوں کی قتل گاہ کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔"

انہوں نے یہ بھی کہا کہ

گزشتہ روز انہوں نے صدر سے اپنی ملاقات کے دوران ان تمام واقعات سے صدر کو آگاہ کر دیا ہے۔ (مساوات - ۲۰ اکتوبر ۷۱ء)

سوچنے کی بات یہ ہے کہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اب اسی جماعت اسلامی کے رضاکاروں اور اس کی ذیلی تنظیم "جمعیت طلباء کے" اللہ کے سپاہیوں" کو اسلحہ مہیا کیا جا رہا ہے!

دوسری خبر یہ ہے کہ صدر مملکت جنرل یحییٰ خان نے پچھلے دنوں فرانس کے ایک اخبار کے نمائندے کو انٹرویو دیا جس میں اس (نمائندہ) نے سوال کیا — "کیا ان افواہوں میں حقیقت کا کوئی شائبہ ہے کہ آپ اور شیخ مجیب الرحمن کے درمیان پاکستان کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے سلسلہ میں بات چیت ہوئی ہے؟" اس کے جواب میں محترم صدر مملکت نے فرمایا۔

میں ایک بار پھر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اس وقت تک ایک باغی کے ساتھ بات چیت نہیں کر سکتا جب تک اس کے خلاف فوجی عدالت الزامات کا جائزہ نہیں لیتی اور اسے بے قصور قرار نہیں دیتی۔ لیکن اس بات کا انحصار شیخ مجیب پر ہے کہ وہ اس امر کا یقین دلا دیں کہ انہوں نے قومی مفادات کے خلاف کام نہیں کیا (نوائے وقت - ۲۰ اکتوبر ۷۱ء)

اس سے ایک عجیب صورت حالات سامنے آتی ہے۔ صدر مملکت گزشتہ اپریل سے لے کر اس وقت تک مختلف مواقع پر متعدد بار اعلان کر چکے ہیں — مقامی طور پر ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی بالفاظ صریح اعلان کر چکے ہیں — کہ شیخ مجیب الرحمن باغی ہے، غدار ہے۔ اس نے ہندوستان کے ساتھ سازش کر کے، پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے اور مشرقی پاکستان کو ایک آزاد مملکت قرار دینے کے لئے عملی اقدامات کئے۔ اس نے "آزاد بنگلہ دیش" کے جھنڈے لہرائے۔ اس کی طرف سے احکامات جاری کئے۔ اس طرح اس نے بغاوت اور غداری کے سنگین ترین جرائم کا ارتکاب کیا۔

یعنی صدر مملکت نے یہ نہیں کہا کہ مجیب پر ان اقدامات کا الزام ہے۔ انہوں نے حتمی اور یقینی طور پر کہا کہ اس نے ان جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ وہ مجرم ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر فوجی عدالت مجیب کو ان الزامات سے بری اور بے قصور قرار دے دے تو پھر صدر مملکت کے مذکورہ بالا بیانات اور اعلانات کی پوزیشن کیا ہوگی اور مجیب کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت کیا؟ یا خود مجیب کے ان کے (صدر کے) ساتھ تعلقات کی کیفیت کیا؟

مجیب کے مقدمہ کے سلسلہ میں' جو بات ہمارے نزدیک سب سے زیادہ نقصان دہ ہے' وہ ہے اس کے فیصلہ میں تاخیر۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ عدالت کو اس باب میں یہ فیصلہ دینا چاہیئے یا وہ۔ یہ بات تو نہ کوئی شخص کہہ سکتا ہے نہ کسی کو کہنی چاہیئے۔ لیکن ہم یہ ضرور کہیں گے کہ اس کے فیصلہ میں مزید تاخیر نہیں ہونی چاہیئے۔ وہ اس لئے کہ جب تک اس کا فیصلہ نہیں ہوتا مشرقی پاکستان کے حالات یکسو نہیں ہوسکتے۔ اس کے حنوا اس آس میں بیٹھے ہیں کہ مجیب واپس آئیگا اس لئے وہ اس اثنا میں اپنے متعلق کوئی سیاسی فیصلہ نہیں کرنا چاہتے۔ اور اس کے مخالفین کو یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ اگر مجیب واپس آگیا تو پھر ہمارا کیا حشر ہوگا اس لئے وہ بھی کھل کر کوئی بات نہیں کرنا چاہتے۔ تیسری طرف ہندوستان بھی" بنگلہ دیش" کے فتنے کو اس وقت تک بیدار رکھنا چاہتا ہے جب تک مجیب کا فیصلہ نہ ہو جائے۔ اور چوتھی طرف' خود پاکستان کی مرکزی سیاست بھی اسی وجہ سے بیم و رجا کے دوراہے پر کھڑی ہے۔ قوموں کے اہم اجتماعی معاملات کے تصفیہ میں تاخیر جہاں بہت سی سیاسی پیچیدگیوں کا موجب بنتی ہے' وہاں اس سے پیدا ہونے والا تذبذب (SUSPENSE) خود قوم کے اعصاب کو جھنجھنا دیتا ہے۔ ہمارے ہاں کی بیشتر الجھنوں اور قوم کی نفسیاتی جھنجھلاہٹ کا ایک بنیادی سبب یہی ہے۔

طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد

۱۔ قرآن کریم مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لئے خدا کی طرف سے آخری، مکمل اور محفوظ ضابطۂ ہدایت ہے۔ اسے سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے عملاً متشکل کر کے دکھایا۔ اس لئے حضورؐ کی سیرت کے نقوشِ قدم اسلامی زندگی کے لئے نشانِ راہ ہیں۔

۲۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے متعلق جو باتیں ہماری کتب روایات و تاریخ میں آئی ہیں، ان میں سے وہی صحیح ہوسکتی ہیں جو قرآن کریم کے خلاف نہ ہوں۔

۳۔ جو حکومت قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کو ملک میں عملاً نافذ کریگی اسے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت یا اسلامی مملکت کہا جائیگا۔

۴۔ اس مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہوگا کہ وہ تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی — خوراک، مکان، لباس، علاج وغیرہ — بہم پہنچائے اور ان کی انسانی صلاحیتوں کے نشو ونما پانے کا انتظام کرے۔

۵۔ اسلامی مملکت میں ملوکیت (یعنی خدا کے قوانین کے بجائے انسانوں کے خود ساختہ قوانین کا عمل) تھیا کریسی (دینی قانون کے معاملہ میں مذہبی پیشواؤں کے حکم کا قولِ فیصل سمجھے جانا) اور سرمایہ داری (یعنی رزق کے سرچشموں پر امت کی بجائے افراد کا قبضہ و اقتدار) نہیں ہوگا۔

۶۔ اسلامی مملکت میں مناصب و مدارج کا معیار جوہرِ ذاتی اور پختگیِ سیرت و کردار ہوگا۔

۷۔ طلوعِ اسلام پاکستان میں اسی قسم کے نظام کے قیام کے لئے فکری اور آئینی کوشش کرتا ہے۔ اس کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے اور نہ ہی کسی مذہبی فرقہ سے۔ نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ ایجاد کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ فرقہ بندی قرآن کریم کی رُو سے شرک ہے۔ امت کے موجودہ فرقے جس طرح نماز، روزہ وغیرہ اسلامی شعائر کے پابند ہیں، یہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتا کیونکہ اس سے ملت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔

۸۔ اگر آپ ان مقاصد سے متفق ہوں تو طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں اس کا ساتھ دیجئے۔ ناظم

طلوعِ اسلام کی چودہویں سالانہ کنونشن

امسال ۲۵ تا ۲۸ نومبر ۱۹۷۱ء (بروز جمعرات، جمعہ، ہفتہ، اتوار) حسبِ سابق بمقام ۲۵۔بی گلبرگ ۲ لاہور منعقد ہو رہی ہے۔ جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے، تحریکِ طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے، اس کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے عملی مسائل سے متعلق جو راہنمائی قرآن مجید سے ملے اسے (بغیر کسی ہنگامہ آرائی اور تفرقہ انگیزی کے)، اس طرح عام کیا جائے کہ اربابِ فکر و نظر، قرآنی نہج پر سوچنے کے عادی ہو جائیں اور اس طرح قوم کے قلب و دماغ میں ایسی خوشگوار تبدیلی واقع ہو جائے جس سے یہاں صحیح اسلامی معاشرہ متشکل ہو جائے۔

۲۔ کنونشن کے کچھ اجلاس تو اراکینِ بزمہائے طلوعِ اسلام تک محدود ہوتے ہیں، اور کچھ ایسے جن میں عام احباب بھی سامعین کی حیثیت سے شریک ہو سکتے ہیں۔ ان کھلے اجلاس میں محترم پرویز صاحب کے بصیرت افروز اور حقیقت کشا خطابات مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس وقت ملک جس بحران سے گزر رہا ہے اور قوم کو جس شدت سے قرآنی راہنمائی کی ضرورت ہے، اسکے پیشِ نظر اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امسال ان خطابات کے موضوع کس قدر اہم ہونگے۔

۳۔ کنونشن کی ایک خاص نشست اس مذاکرہ کیلئے مختص ہوتی ہے جس میں قوم کا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ (بالخصوص طلبا اور طالبات) حصہ لیتے ہیں۔ امسال مذاکرہ کا عنوان ہے

"آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"

۴۔ ایک شب مجلسِ استفسارات آراستہ ہوتی ہے جس میں مفکرِ قرآن (پرویز صاحب) مستفسرین کے سوالات کا جواب اپنے مخصوص رفیع و عمیق اور شگفتہ و شاداب انداز میں دیتے ہیں۔

۵۔ مندرجہ بالا پروگرام مشروط ہے۔ حتمی پروگرام وسط نومبر تک شائع ہو سکیگا۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام

۲۵۔بی۔ گلبرگ لاہور

ادارہ طلوع اسلام کی

کتابوں کی قیمت میں خصوصی رعایت

ادارہ طلوع اسلام ہر سال کنونشن کی تقریب پر اپنی شائع کردہ کتابوں کی قیمت میں خصوصی رعایت دیا کرتا ہے۔ یہ رعایت ان کتابوں پر امسال بھی دی جائے گی جن کی فہرست درج ذیل ہے۔ شرط یہ ہے کہ جو کتابیں مطلوب ہوں ان کی قیمت بذریعہ منی آرڈر ۲۵ نومبر تک موصول ہو جائیں۔ یکم دسمبر کے بعد وہ کتابیں بذریعہ ڈاک بھیجی جائیں گی اور خرچ ڈاک وی۔ پی کے ذریعے وصول کیا جائے گا۔ کنونشن کے موقعہ پر پنڈال کے ساتھ بکسٹال قائم کر دیا جائیگا۔ دستی کتابیں وہاں سے خریدی جا سکیں گی۔

فہرست کتب جن پر رعایت دی جائے گی!

نام کتاب	اصل قیمت	رعایتی قیمت	نام کتاب	اصل قیمت	رعایتی قیمت
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ تین جلدیں)	۸۰/-	۷۰/-	سلیم کے نام (مکمل سیٹ تین جلدیں)	۲۰/-	۱۰/-
اسلام کیا ہے؟ (اعلیٰ)	۸/-	۶/-	لغات القرآن (مکمل سیٹ چار جلدیں)	۵۷/-	۴۰/-
اسلام کیا ہے؟ (سستا)	۴/-	۳/-	پاکستان کا معمار اول	۳/-	۱/۵۰
انسان نے کیا سوچا؟	۱۲/-	۶/-	انسانیت کا آخری سہارا	۱/-	-/۵۰
فردوس گم گشتہ	۸/-	۴/-	عالمگیر افسانے	۱/-	-/۵۰
دھتکارے ہوئے انسان	۵/-	۲/۵۰	الفتنۃ الکبریٰ (اردو) طٰہٰ حسین مصری	۶/-	۳/-
مزاج شناس رسولؐ	۴/-	۱/-	فجر الاسلام (اول) احمد امین مصری	۴/-	۲/-
معراج انسانیت	۲۰/-	۱۵/-	فجر الاسلام (دوم) (اردو) " "	۴/-	۲/-
خدا اور سرمایہ دار	۹/-	۶/-	اسلام پر کیا گزری " "	۵/-	۳/-
بہار نو	۵/-	۲/۵۰	(BOUND) ISLAM, A CHALLENGE TO RELIGION	۲۵/-	۲۰/-
سلسبیل	۸/-	۴/-	(P.B) " " "	۱۶/-	۱۰/-
مقام حدیث	۴/-	۲/-	جہانِ فردا (سستا)	۶/-	۵/-
اسلامی معاشرت	۲/-	۱/-	تاریخ الامت (مکمل سیٹ آٹھ جلدیں)	۲۰/-	۱۰/-
اسباب زوال امت (عمدہ)	۱/۵۰	-/۷۵	قتل مرتد	۱/۵۰	-/۷۵
اسباب زوال امت (سستا)	۱/-	-/۲۵	دستور پاکستان	۲/۵۰	۱/-
			PRINCIPLES OF LAW MAKING IN ISLAM	۲/-	۱/-
جہاد	۲/-	۱/-	منزل بہ منزل	۶/-	۳/-
قرآنی قوانین	۳/-	۲/-			
قرآنی فیصلے (مکمل سیٹ تین جلدیں)	۹/۵۰	۶/-			

کتاب التقدیر کی قیمت پندرہ ۱۵/- روپے فی جلد ہے لیکن بذریعہ ڈاک منگانے والے احباب کو مبلغ ۲/- روپے بطور خرچ ڈاک و پیکنگ مزید ادا کرنے ہونگے۔ اطلاعاً عرض ہے۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

طلوع اسلام کالج فنڈ

(بسلسلہ فہرست مطبوعہ طلوع اسلام بابت اگست ۱۹۷۱ء) حسب ذیل عطیات بشکریہ موصول ہوئے۔

فہرست "الف"

۱۔ عزیزہ سلمیٰ پرویز صاحبہ ۔ لاہور	-/۲۵۰۰
۲۔ " نجمہ صفدر " "	-/۲۵۰۰
۳۔ " عارفی سلطانہ " "	-/۲۵۰۰
۴۔ محترمہ ثریا بیگم "	-/۲۵۰۰
۵۔ محترم شیخ سراج الحق صاحب ۔ لاہور	-/۲۵۰۰
۶۔ محترمہ حفیظ بیگم صاحبہ ۔ لاہور	-/۲۵۰۰
۷۔ محترم شاہ نواز وڑائچ صاحب ۔ لائلپور	-/۲۵۰۰
۸۔ مرزا محمد خلیل صاحب ۔ لاہور [1]	-/۱۰۰۰
۹۔ ڈاکٹر محمد صادق صاحب ۔ کراچی	-/۱۰۰۰

فہرست "ب"

۱۰۔ اسلام آباد کے ایک مخیر دوست جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔	-/۲۰۰
۱۱۔ محترم سعید احمد صاحب ۔ رائے ونڈ	-/۱۰
۱۲۔ " گلزار حسین " "	-/۱۰
۱۳۔ " فیض حسین " "	-/۱۰
۱۴۔ " غلام رسول " "	-/۱۰
۱۵۔ " محمد دین " "	-/۵
۱۶۔ " محمد شفیع " "	-/۵
۱۷۔ " بشیر احمد " "	-/۱۰
۱۸۔ " محمد حنیف " "	-/۱۰
۱۹۔ " محمد علی " "	-/۱۰
۲۰۔ " اللہ دتہ " "	-/۱۰
۲۱۔ محترم غلام محمد صاحب ۔ رائے ونڈ	-/۱۰
۲۲۔ " عبدالمجید صاحب "	-/۱۰
۲۳۔ بزم طلوع اسلام ۔ ڈھاکہ	-/۲۰۵
۲۴۔ محترم عبدالرحمٰن صاحب ۔ لاہور	-/۲
۲۵۔ " ظہور الدین بھٹی صاحب "	-/۵
۲۶۔ " خالد نذیر صاحب "	-/۵
۲۷۔ " بشیر احمد صاحب ۔ ملکوال	-/۵
۲۸۔ " ظہور الدین بھٹی صاحب ۔ لاہور	-/۵
۲۹۔ " سلطان احمد صاحب ۔ چشتیاں	-/۵۰۰
۳۰۔ " ملک حنیف وجدانی صاحب ۔ مری	-/۵
۳۱۔ " محمد ارشاد صاحب ۔ گکھڑ ولگی	-/۵
۳۲۔ " عبدالرحمٰن صاحب ۔ لاہور	-/۲
۳۳۔ " بشیر احمد صاحب ۔ ملکوال	-/۵
۳۴۔ " خالد نذیر صاحب ۔ لاہور	-/۵
۳۵۔ " ظہور الدین بھٹی صاحب "	-/۵
۳۶۔ " محمد عالم صاحب ۔ دوحا (قطر)	-/۵۰
۳۷۔ " خالد حیات صاحب ۔ کراچی	-/۱۲
۳۸۔ محترمہ رابعہ ڈار صاحبہ ۔ لندن (انگلینڈ)	۱۲۶/۴۲
۳۹۔ محترم عزیز اللہ گوندل صاحب ۔ بریڈفورڈ "	۳۱/۷۰
۴۰۔ صوبیدار محمد اکرم صاحب ۔ برننگھم "	۴۲/۱۴
۴۱۔ محترم محمد عباس صاحب " "	۲۱/۷
۴۲۔ " صابر حسین صاحب ۔ بریڈفورڈ "	۲۱/۷
۴۳۔ " فضل کرم صاحب " "	۴۲/۱۴

[1] مبلغ -/۱۵۰۰ کا عطیہ پیشتر دے چکے ہیں۔

نوٹ :- قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ ۲۔ لاہور کو دیئے گئے عطیات سی آر او نمبر ۶۵/(۱۹۶۵)/۴۵۲ مورخہ ۵-۶۹ء ۔ مطبوعہ گزٹ آف پاکستان پارٹ I مورخہ ۱۳-۶-۶۹ کی رو سے انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء سیکشن ۱۵/۵ کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں۔

(سیکرٹری ۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی رجسٹرڈ ۔ لاہور)

تحریکِ پاکستان کی کہانی

(طلوعِ اسلام کی زبانی)

قسطِ اوّل

جیسا کہ ان صفحات پر متعدد بار لکھا جا چکا ہے یہ (بالعموم) ساری قوم کی بدقسمتی' اور (بالخصوص) ہماری نژادِ نو کی حرماں نصیبی ہے کہ آج تک نہ تو تحریکِ پاکستان کی کوئی قابلِ اعتماد تاریخ ہی مرتب ہوئی ہے اور نہ ہی قائداعظمؒ کی سوانح حیات ہی شائع۔ اور غور کیجئے تو یہ دونوں دراصل ایک ہی حقیقت کے دو گوشے اور ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ یہ کام کسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (تحقیقاتی ادارہ) کے کرنے کا ہے۔ لیکن ہمارا نوجوان طبقہ اس سلسلہ میں جس بُری طرح سے بہکا (یا بالفاظِ صحیح 'بہکایا) جا رہا ہے، اس سے ہمیں ڈر ہے کہ تا تریاق از عراق آوردہ شود' مارگزیدہ مردہ شود۔ ہم اس حقیقت کا بھی اظہار کر چکے ہیں کہ جب بھی تحریکِ پاکستان کی تاریخ لکھی گئی اس تحریک کی اساس و بنیاد (نظریۂ پاکستان) کے نقطۂ نگاہ سے اس کے لئے بہترین مواد طلوعِ اسلام کے فائلوں سے ہی مل سکے گا۔ اس لئے کہ ایک تو اس تحریک کے اولین ایام میں یہی ایک مجلہ تھا جو قومیت پرست طبقہ (بالخصوص نیشنلسٹ علماء) کے خلاف کھلی ہوئی لڑائی لڑ رہا تھا' اور دوسرے یہ کہ اس کے اجرار کی وجۂ جواز ہی نظریۂ پاکستان کا تحفظ اور فروغ تھا۔ قائداعظمؒ نے یہ محاذ خصوصیت کے ساتھ اس کے سپرد کیا تھا۔ بنا بریں ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس ضمن میں طلوعِ اسلام نے جو کچھ کیا تھا اس کے کچھ نمایاں خط و خال قارئین کے سامنے لائے جائیں۔ اس سے اس کشمکش کی ایک خفیف سی جھلک' ہماری نئی نسل کے لئے، وجہِ فروغِ دیدہ ہو جائے گی۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد طلوعِ اسلام کا پہلا شمارہ (جو جنوری فروری کا مشترکہ پرچہ تھا) فروری ۱۹۴۸ء میں منصّۂ شہود پر آیا۔ اس میں ہم نے تشکیلِ پاکستان کے پس منظر کو دو چار قسطوں میں' مختصراً پیش کیا تھا۔ اس کی قسطِ اول میں یہ بتایا گیا تھا کہ اس تحریک کے نظریاتی محاذ پر طلوعِ اسلام نے کیا کیا تھا۔ چونکہ تحریکِ پاکستان کی بنیاد ہی ایک نظریہ پہ تھی اور خود اس مملکت کا وجود اسی نظریہ کا رہینِ منت تھا' اس لئے اس تحریک کے نظریاتی گوشے کو خاص اہمیت حاصل تھی اور یہی وجہ تھی کہ ہم نے اس روئداد کی قسطِ اول اسی گوشے کو قرار دیا تھا۔ اشاعتِ حاضرہ میں' اس قسط کو ہدیۂ قارئین کیا جاتا ہے۔ بعد کی قسطوں میں' اس کے سیاسی گوشوں کو سامنے لایا جائے گا۔

اس روداد سے دو باتیں ابھر کر آپ کے سامنے آئیں گی۔ ایک یہ کہ جس نصب العین کو سامنے رکھ کر طلوعِ اسلام کا اجراء عمل میں آیا تھا (اور جسے اس کے سب سے پہلے پرچہ کے افتتاحیہ میں اپریل ۱۹۳۸ء میں تفصیل سے بیان کر دیا گیا تھا)، یہ مجلہ آج تک کہ اس بات کو تینتیس چونتیس سال کا عرصہ گذر چکا ہے، اسی روش پر گامزن ہے اور اس کا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھ رہا ہے۔ یہ صرف اس لئے کہ یہ نصب العین، قرآن کریم کے ابدی اور غیر متبدل حقائق کا متعین کردہ ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ پاکستان کے ایک نظریاتی (یعنی اسلامی) مملکت ہونے کا دعوے، کوئی بعد کی اختراع نہیں، اس مطالبہ کی بنیاد ہی اس دعوے پر رکھی گئی تھی اور اسے، بہ تکرار واصرار اس شدت کے ساتھ، بہانگِ دہل پکارا اور دہرایا گیا تھا کہ ہندوستان کا بچہ بچہ اس سے واقف اور آشنا ہو گیا تھا۔ یہی وہ دعوے ہے جسے اب طلوعِ اسلام، گذشتہ تیئیس چوبیس سال سے مسلسل دہرا رہا ہے۔

اس تعارف کے بعد ہم تحریکِ پاکستان کی کہانی کا نظریاتی گوشہ پیش کرتے ہیں۔ اسے پھر دہرا دیا جائے کہ یہ روداد طلوعِ اسلام بابت جنوری، فروری ۱۹۴۸ء کے افتتاحیہ سے ماخوذ ہے۔ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَان۔

(۱)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

پس منظر

حکایتِ قدِ آں یارِ دل نواز کنم
باین فسانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

زندگی ایک جوئے رواں ہے۔ مسلسل وغیر منقطع، اور حرکتِ پیہم اس تسلسل ودوام کی ذمہ دار۔ خارجی دنیا میں حوادث و وقائع کی کڑیوں کا باہمی ربط، شاہدِ زمانہ کے گیسوئے تابدار کے لئے وجۂ تزئین، اور داخلی دنیا میں افکار وتخیلات کا نظم وضبط، لیلائے وقت کے کاکلِ پیچدار کے لئے باعثِ تمکین۔ اگر خارجی دنیا میں ربط وتسلسل قائم نہ رہے تو تمام شیرازۂ ہستی بکھر جائے اور اگر فکرِ انسانی میں نظم وضبط باقی نہ رہے تو اس ذہنی انتشار کا نام پاگل پن قرار پا جائے۔ طلوعِ اسلام کا نصب العین زندگی کے حقائق کو پیش کرنا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے تسلسلِ فکر نہایت ضروری ہے۔ اپریل ۱۹۳۸ء میں اس کا پہلا پرچہ سامنے آیا اور جون ۱۹۴۲ء تک سلسلہ برابر قائم رہا۔ اس کے بعد اس کی اشاعت میں عارضی تعطل پیدا ہو گیا۔ جب تک یہ شائع ہوتا رہا، یہ ایک ہی نصب العین کی طرف دعوت دیتا رہا۔ وہی نصب العین جسے قرآن نے صراطِ مستقیم کہہ کر پکارا ہے۔ راستہ اور سیدھا راستہ۔ راستے کی ضرورت اس کے لئے ہے جو چل رہا ہو۔ جو بیٹھ جائے اس کے لئے راستہ کا وجود اور عدم وجود برابر ہے۔ اور راستے کا سیدھا ہونا اس کے لئے مفید جس کی منزل متعین ہو۔ جس کے سامنے کوئی منزل نہیں اس کے لئے راستہ کی عوج واستقامت (ٹیڑھاپن اور سدھائی) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا، بالفاظِ دیگر طلوعِ اسلام کی دعوت تعینِ منزل (ایمان) اور حرکتِ پیہم (عمل) کی دعوت تھی۔ ۱۹۴۲ء سے اس دعوت کا سلسلہ رک گیا اور آج بفضلِ ایزدی اس کا پھر اجرا ہو گیا۔ لہٰذا جہاں ہم آج کھڑے ہیں، اس سے پیچھے دو منزلیں اور تھیں۔ ایک (۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۲ء تک) اس کا دورِ اشاعت، اور دوسری منزل (۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک) کا دورِ التوا۔

افکار میں تسلسل قائم رکھنے کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن راہوں سے یہ اپنے دورِ اول میں گزرا ہے ان کے اطراف و جوانب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لی جائے تاکہ وہ تمام نقوش جو مرورِ وقت اور اس کے عارضی التوار کی وجہ سے کچھ دھندلے سے پڑ گئے ہیں اجاگر ہو جائیں۔ اور پھر ان حوادث و ماجریات پر بھی ایک سرسری سی نگاہ ڈال لی جائے جو اس کے زمانہ تغطل میں واقع ہوئے تاکہ آگے بڑھنے سے پیشتر ماضی سے ہمارا رشتہ استوار ہو جائے اور ہمارے تسلسلِ ذہنی میں کوئی خلا نہ رہے۔ اس نگاہ بازگشت سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اس طرح ہماری جنگِ آزادی کے اس دور کی تاریخ ہمارے سامنے آجائے گی جو دور آنے والے مورخ کے نزدیک مسلمانانِ ہند کی زندگی کا اہم ترین دور ہے۔

(۵)

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، طلوعِ اسلام کا پہلا پرچہ اپریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت سے مقصود کیا تھا اس کا اندازہ اس افتتاحیہ سے لگ سکتا ہے جس سے اس کی اشاعت کی ابتدا ہوئی۔

افتتاحیہ دورِ اول

دو ایک کمزور و ناتواں، غریب و نادار بھکاری کی یہ حالت تھی کہ بیچارہ صبح سے شام تک ایک ایک شخص کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا، ہر ایک دروازے پر جھولی پھیلاتا تو بمشکل اتنا پاتا کہ اس سے اپنا پیٹ پال سکے۔ کبھی اتنا بھی نہ پاتا تو فاقہ کاٹتا۔ اس کی ساری عمر یونہی بسر ہو گئی۔ وہ مرتے وقت وصیت کر گیا کہ اسے اس کی جھونپڑی میں ہی دفن کر دیا جائے۔ جب اس کی قبر کھودی گئی، تو لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ نیچے پرانے وقتوں کا ایک گراں بہا خزانہ مدفون ہے۔ بھکاری کی تباہ حال زندگی اور یہ خزانہ لوگوں کے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتا تھا۔

بھکاری اور خزانہ کا واقعہ حقیقت ہو یا افسانہ، لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج مسلمان کی بھی یہی حالت ہو رہی ہے۔ اس نے دنیا میں اپنے آپ کو سب سے نادار، ہر ایک کا دست نگر سمجھ رکھا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے پاس ایک ایسا خزانہ موجود ہے جو اسے ساری دنیا سے بے نیاز کر دے۔

بھکاری کے دکھ کا علاج اسے ایک پیسہ خدا کی راہ میں دے دینا یا اس کی طرف روٹی کا ٹکڑا پھینک دینا نہ تھا، بلکہ اس کی سچی مدد یہ تھی کہ کسی اللہ کے بندے کو معلوم ہوتا تو اسے اس کے خزانہ کا پتہ دے دیتا۔ آج مسلمان کی مصیبتوں کا مداوا بھی یہی ہے کہ اسے اس کے چھپے ہوئے خزانہ سے روشناس کرا دیا جائے جو اس کی خستہ سامانیوں کو سرفرازیوں اور سربلندیوں میں بدل دے۔ یہ متاعِ گراں بہا قرآنِ کریم ہے جو ایک عرصہ سے مسلمان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے اور اب یہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ اس کے اندر ہے کیا؟

آپ کہیں گے کہ مسلمان قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے ہیں، اس کے ترجمے سنتے ہیں، تفسیروں کا درس دیا جاتا ہے، اس کی اشاعت کرتے ہیں اور کیا چاہیئے؟ لیکن اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس سے زیادہ سے زیادہ قرآن کی حفاظت یا اس کے ساتھ مسلمانوں کی عقیدت قائم رکھنے کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے لیکن محض حفاظت اور عقیدت تو مقصود بالذات نہیں۔ قرآنِ کریم کے متعلق مسلمانوں کا دعوے ہے اور یہ دعوے خود قرآنِ کریم ہی پر مبنی ہے کہ خدائے حی و قیوم کی یہ زندہ و پائندہ کتاب ایک مکمل دستورالعمل، ایک بہترین ضابطۂ حیات ہے جو مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں ان کے لئے خضرِ راہ ہے۔ مسلمان کی تو زندگی ہی اس میں تھی کہ وہ ہر ایک قدم اٹھانے سے پیشتر اس امر کا جائزہ لے کہ وہ اپنا قدم اسی جادۂ مستقیم پر لئے جا رہا ہے جسے قرآنِ کریم نے دنیا اور آخرت کی سرفرازیاں حاصل کرنے کا واحد ذریعہ قرار دیا ہے۔ مسلمانوں کی مدنیت و عمرانیت، معاش و معاشرت، مذہب

سیاست غرضیکہ ہر مسئلہ حیات کا حل اسی ایک نظام کی رُو سے ہونا چاہیئے۔ اس کے تمام افکار و تخیلات، اس کے تمام رجحانات قلبی و ذہنی، اس کے تمام تصورات دینی و دنیاوی سب کی تشکیل اسی ایک سانچے میں ہونی چاہیئے۔ اس کے پاس حقائق کے پرکھنے کا معیار ہو تو یہی۔ اور صداقتوں کے ماپنے کا پیمانہ ہو تو یہی۔ سنے تو اس کی رو سے، دیکھے تو اس کی روشنی میں، سمجھے تو اس کی بصیرت سے، اور اس طرح یہ اسکے ایک در دانے پر جھک کر ساری دنیا کے دروازوں سے مستغنانہ و بے نیاز گزر جائے۔

آپ جس مسلمان سے پوچھیئے وہ بلا تکلف کہہ دے گا کہ الحمدللہ میرا بھی یہی ایمان ہے۔ لیکن کیا آج ہو بھی یہی رہا ہے، کیا مسلمانوں کی زندگی کا عملی حل قرآن کریم سے ہی تلاش کیا جاتا ہے؟ کیا ان کا دستور العمل حیات واقعی خدا کا یہ آخری پیغام ہے؟

اس کا جواب اپنے گرد و پیش نظر دوڑا کر خود اپنے آپ سے لیجیئے۔

لیکن اس تصویر کا اس سے بھی بھیانک پہلو ایک اور ہے۔ یہ حفاظت و عقیدت کی بنیاد پر قرآن کریم سے لگاؤ کو نئے مسلمانوں کو ہے۔ کیا انہی کو نہیں جو اب قصۂ ماضی بننے والے ہیں۔ لیکن ذرا اس طبقہ پر نگاہ ڈالئے جو کل کو امت مسلمہ، ملت اسلامیہ کہلانے والا ہے۔ یعنی آج کے نوجوانوں کا تعلیمیافتہ طبقہ۔ جانے والے مسلمانوں نے اس فضا میں پرورش پائی جہاں پھر بھی کچھ نہ کچھ مذہب کا چرچا تھا۔ لیکن یہ آنے والے مسلمان اس ماحول کے تربیت یافتہ ہیں جہاں اور سب کچھ ہے لیکن خدا اور رسول کا ذکر نہیں۔ ذرا کسی نوجوان مسلمان تعلیمیافتہ کے مکان پر جایئے، دنیا بھر کا لٹریچر اس کی الماریوں میں ملے گا۔ لیکن اگر نہیں ملے گا تو قرآن کریم کا نسخہ۔ وہ اپنے بچوں کو بڑے فخر سے آپکے سامنے لائے گا۔ یہ بتانے کے لئے کہ اتنی سی عمر میں یہ کس طرح فر فر انگریزی بولتے ہیں۔ یہ قابل تحسین بات ہے۔ لیکن اگر آپ پوچھ بیٹھیں کہ بیٹا! کلمہ بھی آتا ہے تو وہ آپ کا منہ تکتے رہ جائینگے کہ یہ کس دیس کی بولی بولتا ہے۔!

پھر آپ ان کی درسگاہوں میں جایئے اور دیکھیئے کہ وہاں مذہب سے بیگانگی نہیں بلکہ نفرت پیدا کرنے کے کس قدر سامان موجود ہیں۔ نتیجہ ان تمام اثرات کا یہ ہے کہ آپ کی قوم کے نوجوان مسلمانوں کا سا نام تو رکھتے ہیں کہ اس پر انہیں افتخار رہا تھا۔ اور اب تو نام کو بھی اس انداز سے مروڑتے ہیں کہ اس سے شناخت ہی نہ ہو سکے کہ آپ کس ملت سے متعلق ہیں۔ لیکن ان کے قلب و دماغ کی تعمیر یکسر غیر اسلامی بنیادوں پر ہوئی ہے۔ جو ذرا متین و سنجیدہ ہوں گے وہ دل ہی دل میں مذہب کے خلاف آتش خاموش سلگاتے رہیں گے۔ جو بزعم خویش آزاد منش کے ہونگے وہ اعلانیہ تمسخر اڑائیں گے، پھبتیاں کسیں گے اور یہ سمجھیں گے کہ وہ بہت بڑا جہاد کر رہے ہیں۔

لیکن یہ ان کا قصور نہیں، سب قصور ہمارا ہے کہ ایک طرف ہم نے انہیں مذہب سے ناآشنا رکھا اور دوسری طرف ان کو تعلیم اس نہج پر دلائی جس میں مذہب کے خلاف کشمکش کے تمام سامان موجود تھے اور جہاں کہیں مذہب کی تعلیم کا انتظام بھی کیا وہ اس انداز کا تھا کہ اس سے ان کی بیگانگی الٹی نفرت سے بدل جائے۔

لیکن ذرا تصور میں لایئے اس وقت کو کہ جب آپ نہ ہونگے اور انہی نوجوانوں کی جماعت کا نام مسلمانوں کی قوم ہوگا۔ مفاد اسلامی کے تحفظ کے لئے آپ کی ہر کوشش لائق صد تحسین۔ لیکن سوچیئے تو سہی کہ جن کی خاطر آپ یہ تحفظ کے سامان پیدا کر رہے ہیں، انکی نگاہ میں آپ کے اسلام اور اس کے مفاد کی کوئی وقعت بھی ہے؟ غور فرمایئے کہ کہیں آپ اس نیام کی حفاظت و پرداخت میں تو مصروف نہیں جس کے اندر تلوار لکڑی کی ہے؟

بایں ہمہ نوجوانوں سے مایوس ہو جانے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ ایسے نوجوان بہت کم ملیں گے جنہیں اگر صحیح اسلام سے روشناس کرا دیا جائے تو پھر بھی وہ اپنی لادینی پر مصر ہوں۔ یہ ہماری ہی کوتاہی ہے کہ آنے والی قوم مذہب سے متنفر ہو رہی ہے۔

یہ تھے وہ خیالات جنہوں نے پچھلے دنوں چند صاحب بہت دردمند مسلمانوں کے ایک مختصر سے حلقہ کو دعوت غور و فکر دی۔

جن کی اکثریت نوجوانوں ہی پر مشتمل تھی۔ وہ کافی غور و تدبر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ کر بڑی بڑی سکیموں، شاندار پروگراموں، تہلکہ انگیز تحریکوں کو چھوڑیئے۔ تست وہ آگیا ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ میں "ایک ایک دو دو کر کے ہی خدا کے لئے اٹھ کھڑے ہوئیے۔ پھر سوچو کہ ہمیں کیا کرنا ہے"۔ تجویز یہ ہوئی کہ مسلمان کو اس کی متاعِ گم گشتہ" اس کے چھپے ہوئے خزانہ سے روشناس کرانے کے لئے کچھ کیا جائے۔ اس کا پہلا قدم یہ ہو کہ ایک ماہوار مجلہ شائع کیا جائے جو ملتِ اسلامیہ کی حیاتِ اجتماعیہ کا نقیب ہو۔ اور ان کی ملی زندگی کے ہر مسئلہ کا حل قرآن کریم کی روشنی میں پیش کرے۔ اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ پر یہ حقیقت واضح کر سکے کہ قرآن کریم کوئی ایسی کتاب نہیں جسے ہم دورِ حاضرہ کی چمکتی ہوئی تہذیب اور دمکتے ہوئے فلسفہ کے سامنے لانے سے شرمائیں۔ بلکہ یہ کہ انسان علم و عقل کی جن بلندیوں تک چاہے اڑ کر چلا جائے۔ خدا کا یہ پیغام انہیں وہاں سے بھی دس قدم آگے ہی نظر آئے گا اور جب ساری دنیا کی یہ حالت ہو جائے گی کہ

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے

تو اس وقت تمام دنیا میں امن و امان قائم کرنے کے لئے عدم سکون و فقدانِ اطمینان کی اس آگ کو فرو کرنے کے لئے جس کے شعلوں میں آج انسانیت یوں لپٹ رہی ہے۔ وہی نظام کارفرما ہوگا جو قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ ہے اور جس کے سوا اور کوئی نظام فطرتِ انسانی کے مطابق نہیں ہو سکتا کہ یہ نظام خود خالقِ فطرت کا متعین فرمودہ ہے۔

پھر خدا کے اس پیغام انسانیت کو پیش کرنے والے حضرات ایسے ہوں کہ جن کی انگلیاں ملتِ اسلامیہ کی نبض پر اور جن کی نگاہیں رفتارِ زمانہ کے مقیاس پر ہوں اور ان کا اسلوب بیان اس درجہ دل کش ہو کہ اگر ادبی مذاق رکھنے والے حضرات ان مضامین کو محض ذوقِ ادب کی رعایت سے ہی پڑھنا شروع کر دیں تو بھی چھوڑنے کو جی نہ چاہے اور جب وہ انہیں ختم کریں تو غیر محسوس طور پر پڑھنے والے کے قلب پر وہ ایک ایسا اثر چھوڑ جائیں جو الحاد و کفر نوازی کے تمام شکوک و شبہات کو رفع کر کے ان کے دل میں یہ یقین پیدا کر دے کہ فی الواقعہ قرآن کریم خدا کی کتاب ہے اور نوعِ انسانی کی ہر مشکل کا حل ذہنِ انسانی کی ہر سطح کے مطابق اسکے اندر موجود ہے۔"

اس کے بعد رسالہ کے انتظامی امور کے متعلق کچھ تذکرہ تھا اور آخر میں لکھا تھا۔

"لیکن یہ تمام انتظامات اور ان سے متعلقہ مساعی، یہ تمام تدابیر اور ان کی جزرسی، یہ ولولے اور یہ ارادے، یہ تجاویز اور ان کی تکمیل کے لئے کوششیں، یہ مقاصد اور ان کے حصول کے لئے ذرائع۔ یہ سب انسانی دماغوں کی تخلیق ہیں۔ جو نہ غلطیوں سے مبرا ہیں اور نہ سہو و فروگذاشت سے منزہ۔ جنہیں نہ کل کے آنے والے واقعات کا علم ہے، نہ اس پر تصرف و قدرت! لہٰذا یہ تمام انسانی کوششیں پرِ کاہ جتنا بھی وزن نہیں رکھتیں۔ اگر اس خدائے حی و قیوم کا فضل اور اس کی رحمت شاملِ حال نہ ہو کہ موت و حیات، کامیابی و ناکامی، فلاح و خسران اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی اعانت شریکِ کار ہو تو ادنیٰ سے ادنیٰ کوشش اور کمزور سے کمزور حرکت وہ نتیجہ پیدا کر دے کہ بڑے سے بڑے ساز و سامان رکھنے والے انگشت بدنداں رہ جائیں اور اگر وہی شاملِ حال نہ ہو تو دنیا بھر کی توپیں اور ان کا ہجوم ایک ذرہ کو بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے۔ اس لئے بھروسہ نہ اپنی تجاویز و تدابیر پر ہے نہ قوت و استعداد پر۔ بھروسہ فقط اس کی ذات پر ہے جو ہر کمزور و ناتواں کا حقیقی آسرا، اور ہر نحیف و نزار کا حقیقی ملجا ہے۔ بازارِ مصر میں ایک ضعیفہ کی سوت کی انٹی یقیناً ہر صاحبِ دولت و حشمت کے چہرے پر ایک حقارت کی ہنسی کے آثار پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن چہ عجب کہ اس کے دربار میں جہاں قیمتوں کے معیار بالکل جداگانہ ہوتے ہیں۔ اسی انٹی کی قیمت دولتِ کونین سے بڑھ جائے۔ رد و قبول تو اس کی مشیت پر موقوف ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ سادہ دلی کی یہ جرأت ہی کسی کی شانِ استغنا میں ترحم خسروانہ کا ایک ہلکا سا تبسم پیدا کر دے کہ یہ بے بضاعتی ملاحظہ ہو۔

اور اس کے ساتھ یہ امنگیں اور یہ ولولے! بہرحال جو کچھ ہمارے پاس ہے اسے لیکر اس شاہنشاہ گدا نواز کے آستانے پر حاضر ہو رہے ہیں اس التجا کے ساتھ کہ

کوہِ آتش خیز کن ایں کاہ را ز آتشِ ما سوز غیر اللہ را

رہرواں را منزلِ تسلیم بخش قوتِ ایمان ابراہیم بخش

ان دعاؤں اور التجاؤں کے ساتھ یہ پہلا قدم اس کے راستہ میں اٹھایا جا رہا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ؂ "

ان حسین آرزوؤں اور مقدس تمناؤں کے ساتھ طلوعِ اسلام کا اجرا ہوا۔

―――― (۱) ――――

شعلۂ جوّالہ

حرکت مسلمان کی فطرت میں داخل ہے۔ سیمابیت اس کے ہیولا میں عنصرِ غالب کا حکم رکھتی ہے اگر کہیں خارجی اسباب وعلل اس کے شعلۂ جوالہ کو آتشِ خاموش میں تبدیل بھی کر دیں تو بھی اس کی کیفیت یہ رہتی ہے کہ ذرا سی ہوا دینے سے چھپی ہوئی چنگاری پھر سے بھڑک اٹھتی ہے۔ اس کے بربطِ ہستی کے بظاہر خاموش تاروں کو جذبات کے مضراب سے ذرا چھیڑ کر دیکھئے، پوشیدہ نغمے کن بے تابیوں سے نکلتے اور فضا کو مرتعش کرتے ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں ہندوستان میں اس تحریک کی ابتدا ہوئی جسے بظاہر جنگِ آزادی کا نام دیا گیا۔ لیکن جو باطناً اس ملک میں ہندو راج کے قیام کے منصوبوں پر مبنی تھی۔ سابرمتی کے گوشہ از پرست ساحری کی نگۂ باریک بین نے مسلمان کی فطرتِ سیمابیت کو بھانپا اور اس سے فائدہ اٹھانے کی تدبیر سوچی۔ مسلمان مذہب کے نام پر مستانہ وار اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس نے اپنی تحریک کا دامن تحریکِ خلافت کے ساتھ باندھ دیا۔ دیوانہ را ہوئے بس است۔ پھر کیا تھا۔ مسلمان بگولے کی طرح اٹھ کھڑا ہوا اور ہندوستان کے طول و عرض میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۰ء تک اس کی یہی کیفیت رہی۔ ایک حرکت تھی لیکن بلا مقصد۔ ایک سفر تھا لیکن بلا تعین منزل۔ اس کے سامنے کوئی نصب العین نہ تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ یہ تمام جوش و خروش، یہ وجد و رقص بالآخر ہے کس لئے؟ "چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک تیز رو کے ساتھ" یہ تھا اس کا معمول۔ ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے مقام پر اس مردِ مومن (علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ) نے جسے مبداء فیض کی کرم گستری نے فراستِ ایمانی و بصیرتِ قرآنی سے نوازا تھا، ان کے سامنے ان کی حرکت و عمل کے لئے ایک واضح نصب العین رکھا۔ لیکن جوش و خروش کے زمانہ میں ان باتوں پر کان کون دھرتا ہے؟ بہتوں نے اسے سنا تک نہیں اور جس نے سنا اس نے بھی اسے ان سنی کر دیا۔ ۱۹۳۷ء تک مسلمانانِ ہند کی یہی کیفیت رہی تا آنکہ اس مردِ قلندر کی دوربین نگاہوں نے ایک ایسے معتدل مزاج مدبر کو بھانپا جس میں قوم کو اس واضح و درخشندہ نصب العین کی طرف لیجانے کی صلاحیت تھی۔ اس سے مسلمانانِ ہند کی سیاسی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ وہ اصول و مبانی جن سے اس نئے دور کا آغاز ہوا بالکل صاف اور سادے تھے یعنی

اساسات

(۱) اسلام کی رو سے قومیت کا مدار مذہب پر ہے۔ جغرافیائی حدود۔ وطن کی چار دیواری، زبان اور نسل کا اختلاف، سب غیر فطری امتیازات ہیں۔ نوعِ بشری کی تقسیم صرف ایک معیار پر ہو سکتی ہے۔ یعنی تمام وہ لوگ جو نظامِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے کا عہد کریں، ایک قوم کے افراد اور ان کے علاوہ تمام انسان دوسری قوم کے افراد۔ اسی کا نام ایمان اور کفر ہے۔ اسی تقسیم کو خدا نے حزب اللہ اور حزب الشیطان کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔

(۲) اس معیارِ تقسیم کی رو سے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان ایک جداگانہ، مستقل قوم کے افراد ہیں۔ ہندو اور مسلمان

مل کر ایک قوم کسی طرح نہیں بن سکتے۔

(۴) مسلمانوں کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ نہیں کہ غیر ملک کے حکام (انگریز) یہاں سے نکل جائیں اور ان کی جگہ یہاں کی ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے۔ ان کے نزدیک یہ بھی اسی طرح کی غلامی ہوگی جس طرح انگریز کی حکومت ان کے لئے غلامی ہے۔ آزادی سے ان کا مفہوم یہ ہے کہ یہ اپنے تصورات و معتقدات کے مطابق زندگی بسر کرنے پر قدرت رکھیں اور دنیا میں قرآنی نظام رائج کر سکیں۔

(۵) یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ان کا ایک مستقل مسکن (HOME LAND) ہو کیونکہ ہر دو ملی نظام کے قیام کے لئے زمین کا ہونا لازمی ہے۔

(۶) ہندوستان کی موجودہ شکل میں اس کی آسان صورت یہ ہے کہ مغربی اور مشرقی علاقوں میں جہاں حسن اتفاق سے مسلمانوں کی اکثریت ہے، ان کی الگ اور قائم بالذات حکومت ہو جائے۔ اسی کا نام تقسیم ہند ہے۔ چونکہ ہندو کے دل میں اپنی آزادی سے زیادہ مسلمان پر حکومت کرنے کا شوق چرا رہا تھا اس لئے وہ مسلمانوں کے اس مفہوم آزادی اور اصول حریت کو کس طرح تسلیم کر لیتا؟ اس سے اس کے "رام راج" کا خواب پریشان ہو جاتا تھا اس لئے اس نے مسلمانوں کے اس حق و عدل پر مبنی دعوے کی مخالفت شروع کی اور چونکہ مسلمانوں کے ان تمام دعاوی و مطالبات کا مدار اس بنیاد پر تھا کہ مذہب کی رُو سے وہ ایک الگ قوم ہیں، انہوں نے یہ چلانا شروع کر دیا کہ مذہب ایک نجی (PRIVATE) عقیدہ کا نام ہے جسے سیاست سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیئے۔ ہندوؤں کی طرف سے تو یہ مخالفت ہونی ہی تھی لیکن ہماری بدبختی کہ خود مسلمانوں میں سے بھی ایسے لوگ انہیں مل گئے جو مسلمانوں کے ان مطالبات کی مخالفت میں ان کے ہمنوا ہو گئے۔ ہمنوا ہی نہیں بلکہ ان کے آلات مکبر الصوت بن گئے۔ آنے والے مؤرخ کے لئے یہ منظر بھی حیرت و استعجاب کی عجیب کیفیات پیدا کرے گا، کہ مسلمانوں کے اس دعویٰ کی وکالت کرنے والا ایک ایسا شخص تھا جسے امور دینیہ کے عالم ہونے کا کبھی دعویٰ نہ ہوا۔ اور اس کی مخالفت میں وہ گروہ پیش پیش تھا جو اپنے آپ کو "حاملانِ دین مبین اور مفتیانِ شرع متین" کے القابات سے متعارف کراتا تھا: آپ غور کیجئے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتے کی کہ مسلمانانِ ہند کی گذشتہ دس سال کی تگ و تاز اور جد و جہد خود انہوں کی مخالفت کا مقابلہ کرنے میں صرف ہو گئی طلوع اسلام کی چار سالہ زندگی میں بھی روئے سخن زیادہ تر انہی حضرات کی طرف رہا اور اس باب میں اس کی مساعی جس انداز سے مشکور ہوئیں اس کے لئے ہم اس بارگاہِ صمدیت کے حضور قدم قدم پر سجدہ ریز ہیں کہ اس کی توفیق و نصرت کے بغیر اس ہجوم مخالفت کا مقابلہ کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ یہ لوگ عوام کو یہ کہہ کر دھوکا دیتے تھے کہ جس آزادی کے طالب ہندو ہیں، اس میں مسلمانوں کو پوری مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔ لہٰذا سب سے پہلے یہ بتانا ضروری تھا کہ مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا صحیح

سوراجی اسلام

مفہوم کیا ہے اور جب تک کسی مذہب کی آزادی ہندو اکثریت کی حکومت میں حاصل ہو سکتی ہے اسکی حقیقت کیا ہے۔ اس کے لئے جون ۱۹۳۸ء میں جناب رازی کے قلم سے ایک مبسوط مقالہ بعنوان "سوراجی اسلام" شائع ہوا جس نے فریق مخالف کی ابد فریبیوں کے نقاب کی دھجیاں بکھیر دیں۔ والحمد للہ رب العالمین

اگست ۱۹۳۸ء کے طلوع اسلام کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:۔

"تاریخ عالم کے زمانۂ قدیم پر نگاہ ڈالئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ قوت و سطوت کی مالک قومیں دوسری قوموں کو تباہ و برباد

واردھا کی تعلیمی اسکیم

کرنے کے لئے قتل و غارت گری اور کشت و خون کے کیا کیا طریقے اختیار کرتی ہیں۔ چنگیز خان و ہلاکو کی خونچکاں داستانیں صفحات تاریخ پر خون کے حروف میں لکھی ملتی ہیں۔ فرعون و نمرود، شداد و ہامان کے جور و استبداد کے واقعات پڑھنے والے کی روح میں کپکپی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ دور جہالت تھا، علانیہ بہیمیت و بربریت کا زمانہ تھا، عصر حاضر کا مہذب انسان اس دور وحشت کو سخت نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنے زمانہ کو خدا کی رحمتوں اور برکتوں کا زمانہ سمجھتا ہے کہ جس میں قتل و خونریزی کی وہ داستانیں نہیں دہرائی جاتیں جس میں لے انسانیت ترستی بلکتی، پھڑکتی نظر آئے۔ لیکن جو لوگ حقائق اشیاء کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں ان پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ عصر حاضر کا مہذب انسان بھی دوسروں کی ہلاکت و بربادی میں عہد جہالت کے وحشی انسان سے کسی حالت میں کم نہیں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ عہد جہالت تھا جس میں انسان نے ابھی یہ نہیں سیکھا تھا کہ اپنی ستم کوشیوں اور ظلم رانیوں کو کس طرح اصلاح و بہبود کے خوش آئند نقاب اڑھائے۔ وہ جو کچھ کرتا تھا کھلم کھلا کرتا تھا۔ بنا کر، جتا کر، دکھا کر کرتا تھا لیکن آج انسان عقل و حکمت میں بہت ترقی کر چکا ہے۔ آج اسی طرح کھلم کھلا ہوس خون آشامی کو پورا کرنا حماقت سمجھا جاتا ہے۔ آج سب سے زیادہ مدبر سب سے زیادہ ہوشیار وہ ہے جو دوسروں کا خون اس انداز سے پی جائے کہ اس کا دھبہ تک نظر نہ پڑے۔ وہ دوسروں کی متاع حیات کو اس مشفقانہ انداز سے لوٹ لے کہ اس پر رہزن و قزاق ہونے کا شبہ تک نہ ہو۔ وہ ناصح و مصلح کے معصوم لباس میں قوم کی قوم کو تباہ کر جائے اور یہ حالت کہ لٹنے والوں کو پتہ ہی نہ چلے کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ دور جہالت کا وحشی اور ظالم انسان آج تک بدنام چلا آتا ہے کہ اس کے جور و ستم کی ہلاکت آفرینیاں گویا ایک طوفان بلاخیز ہیں جو کف بر دہان بڑھتا، امنڈتا، بپھرتا چلا آتا ہے کہ جس کی طغیانیوں کو اندھے بھی دیکھتے ہیں اور جس کی شورانگیزیوں کو بہرے بھی سنتے ہیں۔ لیکن دور حاضر کے مہذب انسان کی استہلاک و تخریب کی چالیں ایک پرسکوت دریا کی مانند ہیں کہ جس کی روانیوں میں نہ شور ہے نہ تموج۔ لیکن سطح آب کے نیچے ایسے ایسے خوفناک مگرمچھ چھپے ہوتے ہیں کہ قوم کی قوم کو تباہ کر دیں۔ لیکن نہ دیکھنے والی آنکھیں دیکھ سکیں اور نہ سننے والے کان سن سکیں۔ اس پرسکوت طریق تخریب اور اس آتش خاموش میں سب سے بڑا حصہ تعلیم کو حاصل ہے۔ آپ جس قوم کو تباہ و برباد کرنا چاہیں نہایت خاموشی سے اس کے طریق تعلیم کو بدل دیجئے، وہ رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر ہلاکت و بربادی کے عمیق و مہیب غاروں میں کھنچی چلی جائے گی اور اسے پتہ اس وقت چلے گا جب وہ سکرات موت کی ہچکیاں لے رہی ہو گی۔ اکبر مرحوم نے اس جانکاہ حقیقت کو کس قدر بلیغ اور اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے کہ ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!"

تعلیم کی یہ اہمیت ہندو قوم کے سب سے بڑے راہ نما، مہاتما گاندھی کی پیش نظر تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کی آئندہ نسلوں پر حکومت کرنا ممکن نہ ہو گا جب تک ان کے ذہنی تصورات کو نہ بدل دیا جائے اور اس کی آسان ترین شکل یہ ہے کہ ان کے نصاب تعلیم کو بدل دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر ایک تعلیمی کمیٹی کی تشکیل ہوئی جس نے شروع ۱۹۳۷ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس اسکیم کا نام "واردھا کی تعلیمی اسکیم" تھا۔ اس اسکیم میں ایسے ایسے زہریلے نشتر چھپا رکھے تھے کہ اگر یہ خدانخواستہ وہ کہیں مسلمانوں میں رائج ہو جاتی تو یہ نشتر ان کی آئندہ نسلوں کے رگ جان میں پیوست ہو جاتے۔ اگست ۱۹۳۸ء کے طلوع اسلام میں اس دام ہمرنگ زمین کا اس وضاحت سے تجزیہ کیا گیا کہ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يَبُورُ۔ ان کی خفیہ تدبیریں سب برباد

ہو گئیں) کی تفسیر سامنے آگئی۔ جس اقتباس سے اس عنوان کی ابتداء ہوئی وہ اسی مضمون کا اقتباس ہے۔ ادارۂ طلوعِ اسلام نے اپنے پیشِ نظر اسلوبِ اشاعت یہ رکھا تھا کہ اس قسم کے اہم مضامین کو الگ پمفلٹ کی شکل میں شائع کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس مضمون کا پمفلٹ ملک کے طول و عرض میں پھیلا دیا گیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں مختلف زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہوئے۔ پشتو، گجراتی، ہندی، ملیالم، سندھی وغیرہ۔ اندازہ یہ ہے کہ اس مضمون کے قریب اسّی ہزار پمفلٹ ملک میں تقسیم ہوئے اور نتیجہ اس نشر و اشاعت کا یہ ہوا کہ اسکیم بُری طرح سے ناکام رہی۔ فالحمد للّٰہ علیٰ ذالک۔

———— (۲) ————

تعلیم بدلنے کے ساتھ ہی زبان بدلنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کو مٹانے کے لئے جو پروگرام وضع کیا گیا تھا اس میں زبان کی غیر محسوس تبدیلی کو خاص اہمیت دی گئی تھی۔ سیدھا سادہ مسلمان اس حسین فریب سے قطعاً ناآشنا تھا۔ اسے اس عظیم خطرہ سے آگاہ کرنے کے لئے اکتوبر ۱۹۳۸ء کے طلوعِ اسلام میں "زبان کا مسئلہ" کے عنوان سے ایک مفصل مقالہ شائع ہوا جس کی تمہید ان الفاظ سے ہوئی:۔

زبان کا مسئلہ

"وردھا اسکیم والے مضمون میں ہم بصراحت لکھ چکے ہیں کہ اس آئینی تبدیلیوں کے زمانہ میں ہندوؤں کے پیشِ نظر سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ جوں جوں ملک کی حکومت ان کے ہاتھ میں آتی جائے وہ ایسی تدابیر اختیار کریں جن سے ہندوستان میں مسلمان من حیث القوم زندہ نہ رہ سکیں۔ مسلمانوں کا الگ قومی تشخص انہیں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں جتنی قومیں باہر سے آئیں اور جنہوں نے یہاں بود و باش اختیار کی ان میں سے صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جسے یہ "اکال الامم" اپنے اندر جذب نہیں کر سکا۔ ورنہ ان کے علاوہ سب کے سب رفتہ رفتہ یہاں پہنچ کر ہندو ہو گئے۔ مسلمانوں کی انفرادیت مٹانے کے لئے ہندو پوری قوت سے سرگرم عمل ہے اور اس کے لئے اس نے طریق کار وہ اختیار کیا ہے جسے ہم نے دریا کی تہ بہ تہ رو انیوں سے تشبیہ دی تھی۔ میدانِ سیاست میں ایک "متحدہ قومیت" کی حسین تشکیل کا تصور پیش کیا جا رہا ہے اور اس کے بھیانک اور خطرناک نتائج و عواقب کو (جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے) "جمہوری حکومت کے خاتمہ" کے دلفریب نقاب میں پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ اختلافِ مذاہب چونکہ "ہندو مسلم اتحاد" کے راستہ میں روڑا اٹکاتا ہے اس لئے مذہب کو سیاست سے الگ رکھنے کا معصوم سبق دیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کا یہ ایمان کہ اسلام تمام ادیانِ عالم پر فوقیت رکھتا ہے، چونکہ بچوں کے قلب و دماغ کو "تنگ نظری اور تعصب" کے زہر سے مسموم کر دیتا ہے اس لئے درسگاہوں میں ایک ایسے مذہب کی تعلیم کی تجویز کی جا رہی ہے جو اکبر کے دینِ الٰہی، یعنی دورِ حاضر کے برہمو سماج کے خطوط پر مشتمل ہے۔ جہاں تک ممکن ہے چونکہ سبعیت و بربریت کے خونخوار جذبات کی تحریک ہوتی ہے اس لئے اس کی جگہ اہنسا کا فلسفۂ حیات جنت قلب و نظر بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اور تعلیم کے ان تمام غیر اسلامی عناصر کو "روبی" کے دلکش غلاف میں لپیٹ کر ایسا خوش آئند سنیوسہ بنا دیا گیا ہے کہ جو دیکھے لپک کر اٹھا لے۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے اردو کی جگہ ہندی زبان کی ترویج ہو رہی ہے اور اصل مقصد کو نگاہوں سے اوجھل رکھنے کے لئے کہا یہ جاتا ہے کہ متحدہ قومیت کے لئے ایک مشترکہ زبان کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

مسئلہ کی اہمیت

مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور انہیں اس غلط فہمی میں اور زیادہ مبتلا کیا جا رہا ہے کہ زبان کا مسئلہ محض ایک ادبی مسئلہ ہے کسی قوم کے مذہب اور تہذیب سے اس کا کیا تعلق؟ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں کہ کسی قومیت کو بنانے اور بگاڑنے میں، کسی تہذیب کو زندہ رکھنے اور فنا کر دینے میں، کسی قوم کا مذہب سے تعلق باقی رکھنے اور منقطع کر دینے میں، زبان کا ایک غیر معمولی اثر ہوا کرتا ہے جس قوم

کے پاس اپنی زبان اور اپنا رسم الخط ہے، وہ ایک مستقل قوم ہے اور جس قوم کی زبان میں خود اپنا لٹریچر موجود ہے اور ترقی کر رہا ہے وہ ایک زندہ قوم ہے۔ جس وقت وہ قوم اپنی زبان چھوڑنے اور اپنا رسم الخط بدل دینے پر آمادہ ہو جائے اُس وقت سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اپنی قومیت کو بدل رہی ہے، اپنی تہذیب سے رشتہ منقطع کر رہی ہے، اپنی قبر اپنے ہاتھوں کھود رہی ہے۔ غیر محسوس طور پر تباہی ... اور بربادی کے عمیق غاروں کی طرف کھنچی جا رہی ہے۔

یہ ایک "تنگ نظر" مسلمان ہی کا خیال نہیں ہے بلکہ "کشادہ ظرف" ہندو بھی اس کے مؤید ہیں۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں :۔

"ایک قوم کے لئے زبان کا مسئلہ بڑا اہم رہا ہے۔ آج سے تین سو برس پیشتر ملٹن نے فلورنس سے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے اس کی اہمیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔ کسی قوم کے اپنی ایک زبان رکھنے کو خواہ وہ زبان بگڑی ہوئی ہو یا خالص ہو، ایک غیر اہم سا واقعہ نہ سمجھ لینا چاہیئے اور نہ اس امر کو کہ اس کے افراد زبان کے برتنے میں صحت کا کہاں تک لحاظ رکھتے ہیں، کوئی تاریخی شہادت ایسی نہیں ملتی کہ کوئی سلطنت یا مملکت اس وقت تک اوسط درجہ کی خوشحالی و فلاح سے محروم کر دی جا سکتی ہو جس وقت تک اس کے افراد اپنی زبان کو پسند کرتے اور اس کی طرف کافی توجہ کرتے رہے ہوں۔"

ایک دوسری جگہ پنڈت جی فرماتے ہیں :۔

"رسم الخط اور ادب کا بہت ہی گہرا تعلق ہے اور رسم الخط کی تبدیلی اس زبان کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس کا ماضی شاندار رہا ہو۔ رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں، آوازیں بدل جاتی ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں۔ قدیم و جدید ادب کے درمیان ایک ناقابلِ عبور دیوار حائل ہو جاتی ہے اور قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہو چکی ہو۔" (میری کہانی ۔ جلد اول صفحہ ۲۹۵)

ان الفاظ کو ذرا غور سے پڑھیئے اور انہیں دل کی گہرائیوں میں جگہ دیجئے کیوں کہ اس مضمون میں ان کی طرف بار بار توجہ کرنی پڑے گی۔"

اس مضمون کا پمفلٹ بھی بار بار چھپا اور اطراف و جوانب میں پھیل گیا۔

(۰)

متحدہ قومیت اور مولانا حسین احمد مدنی

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اس سیاسی کشمکش کے دور میں سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ نظریۂ قومیت تھا۔ ۱۹۳۸ء کے آغاز میں اس نظریہ سے متعلق ایک اہم بحث کا سلسلہ چھڑا۔ بات یوں ہوئی کہ "مولانا" حسین احمد صاحب، شیخ الحدیث، دار العلوم دیوبند نے اپنی تقریر کے دوران فرمایا کہ "اس زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں مذہب سے نہیں بنتیں"۔ چونکہ یہ نظریہ اسلام کے شجرِ طیب کی جڑ پر تبر چلانے کے مرادف تھا اور پیش ہو رہا تھا ایک ایسے گوشے سے جسے مسلمانوں کی دینی تعلیم کی مرکزی حیثیت حاصل تھی، اس لئے ملتِ اسلامیہ کے قلبِ حساس میں اس سے ایک ٹیس پیدا ہوئی اور آہ آتشیں کی شکل میں ان الفاظ میں لب تک پہنچی کہ

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است — چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است (علامہ اقبالؒ)

جناب حسین احمد صاحب بجائے اس کے کہ ان اشارات سے متنبہ ہو جاتے اور اپنی غلطی کا اعتراف فرما لیتے، اُلٹے نعل برآتش ہو گئے اور اپنے نظریہ کی تائید میں ایک لمبا چوڑا بیان شائع کر دیا جس میں فرمایا کہ

یہ دعویٰ کہ اسلام کی تعلیم، قومیت کی بنیاد، جغرافیائی حدود، یا نسلی وحدت یا رنگ کی یکسانی کے بجائے، شرف انسانی اور اخوتِ بشری پر رکھتی ہے، مجھے معلوم نہیں کہ کونسی نص قطعی یا ظنی سے ثابت ہے۔

علامہ اقبالؒ پر ان دنوں مرض الموت کے سخت دورے پڑ رہے تھے لیکن معاملہ کی نزاکت اور اہمیت کے احساس نے انہیں مضطرب و بے قرار کر دیا اور نظریۂ قومیت کے متعلق انہوں نے وہ بیان شائع فرمایا جو اس باب میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بیان ایسا مسکت و جامع تھا کہ جناب حسین احمد صاحب کو یہ کہنا پڑا کہ "میرا مقصد دہلی کی تقریر میں اخبار تھا، انشاء نہ تھا" بات ختم ہو گئی۔ لیکن علامہ اقبالؒ کی وفات کے قریب چھ ماہ بعد جناب حسین احمد صاحب نے مرحوم کے متذکرہ صدر بیان کی تردید میں ایک پمفلٹ بعنوان "متحدہ قومیت اور اسلام" شائع کر دیا۔ طلوع اسلام نے اپنا فریضہ سمجھا کہ اس کے جواب میں قرآن کریم کے نظریۂ قومیت کو وضاحت سے بیان کر دیا جائے تاکہ ملتِ اسلامیہ اس کے برعکس غلط تعلیم کے مسموم اثرات سے محفوظ رہ جائے۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۹ء کے رسالہ میں اس عنوان پر ایک مبسوط و جامع مقالہ شائع ہوا جس کا جواب کسی سے بن نہ پڑا اور یہ سب اللہ کی توفیق سے ہوا۔

(۰)

اس سیاسی کشمکش کا سلسلہ یونہی جاری رہا۔ ملت اسلامیہ کی اکثریت مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور الگ حکومت کے دعوے کی تائید میں تھی لیکن "قومیت پرست" گروہ ان کی مخالفت میں دن رات مصروف تھا اور یا للعجب کہ اس مخالفت میں جمعیۃ العلمائے ہند صف اول میں تھی۔ آٹھ نو برس ہو چکے تھے کہ جمعیت کا کوئی سالانہ اجتماع نہیں ہوا تھا لیکن اس مخالفت کے جوش نے ان میں پھر سے حرکت پیدا کی اور اوائل مارچ ۱۹۳۸ء میں دہلی میں ان کا اجتماع ہوا۔ یہ بڑا نازک وقت تھا اور ایسے وقت میں مسلمانوں کے ملی مطالبہ کی مخالفت میں ایک ایسا اجتماع خاص اہمیت رکھتا تھا۔ طلوع اسلام کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ اپنے غلط رو بھائیوں کو سیدھا راستہ دکھانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ چنانچہ اس اجتماع کی تقریب پر اس کی طرف سے ایک جامع مقالہ بعنوان "عرضداشت بخدمت علماء کرام" شائع ہوا اور جلسے کے پہلے دن خاص اہتمام سے اسے مفت تقسیم کیا گیا۔ اللہ نے اس کی اس کوشش کو مشکور فرمایا۔ اور عوام اس فریب کا شکار ہونے سے بچ گئے جو اس معصوم انداز سے کھیلا جا رہا تھا۔

(۰)

پہلی سال گرہ

اس طرح طلوع اسلام کی زندگی کا پہلا سال ختم ہوا، اور دوسرے سال کی ابتدا ان دعاؤں اور التجاؤں کے ساتھ ہوئی۔

"اس خدائے حی و قیوم کے نام سے جو حیات و قوت کا سرچشمہ اور زندگی و توانائی کا مبداء ہے طلوع اسلام اپنی عمر کے دوسرے سال میں اس "شکر و شکایت" کے ساتھ قدم رکھتا ہے کہ

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا — رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند
اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو — لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند
تاثیر ہے یہ میرے نفس کی کہ خزاں میں — مرغانِ سحر خواں میری صحبت میں ہیں خورسند
لیکن مجھے پیدا کیا اُس دیس میں تو نے — جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

شکر اور بے پایاں شکر اس کی توجہات کرم کا، اور شکایت اور بے غایت شکایت اس تقدیر کی جس کے خلاق خود ہمارے اپنے اعمال ہیں اور جس کی وجہ یہ بکھرا ہوا نظام ہے۔ بہر حال یہ بھی اُسی کے گوشۂ التفات کا تصدق ہے کہ اس جاہلیت کی جہنمی زندگی کا احساس تو ہو گیا جو ایک عرصے سے جنت نگاہ بن رہی تھی۔ دعا ہے کہ جب یہ احساس دیا ہے تو اس زندگی کو بدل ڈالنے کی توفیق بھی عطا کرے۔

بیا ساقی! بگرداں جام مے را　　　نئے سوزندہ ترکن سوز نئے را
دگر آں دل بنہ در سینۂ من　　　کہ بینم بیخیۂ کاؤس و کے را

زندگی نام ہے آرزو کا — آرزو جس قدر زندہ ہو، زندگی اتنی ہی تابندہ ہوتی ہے۔ طلوع اسلام زندہ آرزوؤں اور درخشندہ تمناؤں کی ایک حسین جنت (در آغوش) اس شاہنشاہِ دوعالم کے آستانۂ اقدس پر جھولی پھیلائے کھڑا ہے جس کے ابرِ جود و سخا کی گوہر باریوں سے ہر خشک ٹہنی بہارِ صد گلستاں بداماں ہے۔ چہ عجب کہ اس کی ناچیز نوازیوں سے اس کی شاخِ تمنا بھی سرسبز ہو جائے۔

ارادے نہایت بلند ہیں لیکن ان کی تکمیل۔ اے چارہ سازِ بے کساں! صرف تیرے ہاتھ ہے۔ عزائم پختہ راسخ ہیں لیکن ان کی بر آوری، اے مدد فرمانے والے! ناتواں صرف تیری عطا کردہ توفیق پر منحصر ہے۔ اے رب العزت! سہارا صرف تیری ذات کا سہارا ہے۔ آسرا صرف تیرا آسرا ہے۔ باقی بتانِ آذری۔ جو کچھ ابھی ہماری دنیائے تخیلات میں ہے اسے محسوس پیکر عطا فرمادے۔ جو عالمِ تصور میں ہے اسے مشہود بنادے بشرطیکہ جو کچھ ہم سوچتے ہیں وہ ہمارے لئے بہتر ہو۔ تیرے بتائے ہوئے راستے کے مطابق ہوائیے خوابوں کو حقیقت بنا دینا صرف تیرے اختیار میں ہے۔ ؎

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تُو مجھے گوہرِ شاہوار کر

ان دعاؤں اور ان التجاؤں کے بعد ایک نصیحت اس "طفلکِ یکسالہ" (طلوع اسلام) کے لئے بھی ہے۔ ؎

آتش بندد اگر شبنمِ بے مایہ ترا　　　خیز و بر داغِ دلِ لالہ چکیدن آموز
اگرت خارِ گلِ تازہ رسے ساختہ اند　　　پاسِ ناموسِ چمن دار و خلیدن آموز
باغباں گر ز خیابانِ تو بر کند ترا　　　صفتِ سبزہ دگر بار دمیدن آموز

تا تو سوزندہ تر و تلخ تر آئی بیروں
عزلتِ غمکدۂ گیر و رسیدن آموز

واللہ المستعان۔ علیہ توکلت والیہ انیب۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم"

———— (۰) ————

کانگریس بے نقاب

طلوع اسلام کی شروع ہی سے یہ پکار تھی کہ کانگریس کی تحریک مسلمانوں کے لئے آزادی کی تحریک نہیں بلکہ یہ ایک خالص ہندو مذہبیت کی تحریک ہے اور مقصد اس سے مسلمانوں کی ملی خصوصیات کو مٹا کر ملک میں "رام راج" کا قیام ہے۔ قومیت پرست مسلمان اس کی تردید کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ تحریک خالص سیاسی تحریک ہے۔ اس میں ہندوؤں کے پیشِ نظر کوئی ایسے عزائم نہیں۔ لیکن یہ راز کب تک مستور رہتا۔ اگست ۱۹۳۹ء میں کانگریس کے جنرل سیکرٹری، اچاریہ کرپلانی کی طرف سے کانگریس کے عزائم و مقاصد سے متعلق ایک مبسوط بیان شائع ہوا جس میں

اس نے کھلے کھلے الفاظ میں اس حقیقت کا اعلان کیا کہ کانگریس کی تحریک اس فلسفۂ زندگی کے احیاء و ترویج کی تحریک ہے جسے مہاتما گاندھی پیش کر رہے ہیں۔ کانگریس کو محض سیاست کے دائرہ تک محدود سمجھنا غلطی ہے۔ اس کی تحریک ہر گوشۂ زندگی کو محیط ہے۔ ستمبر ۱۹۳۹ء کے پرچہ میں طلوعِ اسلام کی طرف سے اس بیان کا تجزیہ کیا گیا اور قومیت پرست مسلمانوں سے پوچھا گیا کہ

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما!

کانگریس کی اس طرح نقاب کشائی سے بہت سی سعید روحیں اپنی غلط روی پر متنبہ ہو گئیں اور باقی وہی رہ گئے جن کے پیشِ نظر کچھ اپنے مقاصد تھے۔

(o)

یومِ نجات

۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت، کانگریس نے ہندو اکثریت کے صوبوں میں زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور اڑھائی سال تک مسلمان اقلیت پر جس جس انداز سے مظالم توڑے اُن کی یاد آج بھی ہر قلبِ حساس کو طلسمِ پیچ و تاب بنا دیتی ہے۔ خدا خدا کر کے اس دورِ استبداد کا خاتمہ ہوا جب کانگریسی وزراء نے اپنے عہدوں سے استعفے دیدیئے۔ اس بلائے عظیم سے رستگاری پر مسلم لیگ نے "یومِ نجات" منایا اور اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام نے ایک جامع پمفلٹ میں بتایا کہ مسلمانوں کے یہ سجدہ ہائے تشکر و امتنان اس لئے ہیں کہ مسلمان دنیا میں نہ انگریز کا غلام رہ کر جی سکتا ہے نہ ہندو کا۔ یہ صرف اپنے اللہ کا غلام اور اس کے آئین کا محکوم رہ کر ہی بحیثیتِ مسلمان زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اسی پرچہ (جنوری ۱۹۴۰ء) میں "نیشنلسٹ علماء" کے عنوان سے ایک مبسوط مضمون کی پہلی قسط شائع ہوئی جو ان حضرات کے سامنے ان کی صحیح تصویر پیش کرنے کی ایک جاذب کوشش تھی۔

(o)

مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ۱۹۳۷ء سے ہوا۔ دو سال کے عرصہ میں ملتِ اسلامیہ کے اس اہم "مقدمہ" کے وکیل نے اس کے اصول و مبادیات کی تشریح و توضیح میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ "مسلمان ایک مستقل جداگانہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں" ــ "مسلم لیگ اس قوم کی واحد نمائندہ جماعت ہے" یہ تھے وہ بنیادی اصول جو اس دو سال کے عرصہ میں بدلائل منبر و براہین قاطعہ دنیا کی عدالت میں بار بار پیش کئے گئے۔ اب وقت آ چکا تھا کہ اس قوم کے اصل دعوے کو واضح الفاظ میں سامنے لایا جائے۔ اس مقصد کے لئے مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور مسلم لیگ کا وہ معرکہ آرا اجلاس منعقد ہوا جس نے نہ صرف ملتِ اسلامیہ کی تقدیر بدل دی بلکہ دنیا کے نقشے میں ایک اہم تبدیلی پیدا کر دی۔ اس تقریب پر ملتِ اسلامیہ کی کشتی کے ناخدا، قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی خدمت میں ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا جو درحقیقت پوری قوم کی طرف سے سپاسنامہ تھا۔ ہم اس سپاسنامہ کو بصد فخر و مسرت اس مقام پر دہراتے ہیں۔

"بہ ملاحظہ نظر!

شیر بیشۂ بیباکی و حریت، ضیغم نیستانِ جرأت و بسالت۔ شاہینِ افلاکِ تدبر و سیاست، پروانۂ شمعِ اخوت و حمیت، طرۂ کلاہِ ملک و ملت۔ بطلِ جلیل ہندیاں و قائدِ اعظم اسلامیاں، عظمت مآب ــ

محترم المقام جناب محمد علی جناح مدظلہ العالی

حریت نواز! ذرا تصور میں لایئے اس وقت کو کہ ایک وحشت انگیز ہولناک بیابان میں راہ گم کردہ مسافروں کا ایک

بکھرا ہوا قافلہ نشانِ منزل سے مایوس ہو کر ضعفِ عزیمت سے پاشکستہ بیٹھ چکا ہو۔ ایک درماندہ راہرو کی صدائے دردناک جو آوازِ رحیل کا کام دے رہی تھی، فطرت کے اٹل قوانین کے ماتحت خاموش ہو چکی ہو۔ شام کا بھیانک سناٹا سر پر منڈلانے والی شبِ تیرہ وتار کی ہیبت انگیزیوں کا پیام جانکاہ دے رہا ہو۔ غاروں میں چھپے ہوئے درندوں کے پاؤں کی آہٹ موت کو قریب تر لاتی نظر آرہی ہو، درختوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے رہزنوں کی ریشہ دوانیاں دامنِ صحرا پر پھیلتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ بڑھتی چلی آرہی ہوں، وہ لوگ جن کی قیادت وسیادت پر بھروسہ تھا برادرانِ یوسف کی طرح اپنے قافلے کی گراں بہا متاع دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالنے کی فکر میں ہوں۔ غرضیکہ ہلاکت یقینی اور تباہی اٹل معلوم ہوتی ہو۔ افرادِ قافلہ میں سے جن کے دلوں میں اس الم انگیز کیفیت کا احساس ہو، ان کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھ رہی ہوں کہ دور افق کے اس پار سے ایک شاہسوار رواں دواں، امیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لئے ان سوختہ سامانوں کی طرف بڑھتا چلا آئے۔ منتشر افرادِ کارواں کو پھر سے ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دے اور اپنوں اور بیگانوں کی تیار کردہ ہلاکت و بربادیوں کی گھاٹیوں سے بچاتا ہوا انہیں کسی محفوظ مقام کی طرف لیجانے کی فکر کرے، اندازہ فرمائیے کہ جو قلبی کیفیت اس وقت ان راہ گم کردہ مسافروں کی ہوگی، وہی حالت آج ملتِ اسلامیہ (ہندیہ) کی ہے۔ تحریکِ آزادی کے آغاز میں مسلمانوں کی عمومی حالت یہ تھی کہ یہ ریت کے ذروں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ تیز ہوا کا جھونکا آتا اور انہیں ادھر سے ادھر اڑائے جاتا۔ پانی کی رو آتی اور انہیں اپنے ساتھ بہالے جاتی۔ اس کاروانِ بے سالار کی متاعِ گراں بہا کو لوٹنے کے لئے چاروں طرف سے قومیں ہجوم کرکے آرہی تھیں۔ غیر تو غیر خود اپنوں کی یہ حالت تھی کہ ان کی سحر طرازیاں اور فسوں سازیاں ملتِ بیضا کو فدائے طورِ سینا سے ہٹا کر گوسالہ پرستی کی دعوت دیتی تھیں۔ غرضیکہ حالت یہ تھی کہ

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے تھے کسی مردِ راہ داں کے لئے

قوم کی صحیح راہ نمائی کرنے والے ایک ایک کر کے چل بسے تھے۔ بزمِ ملت کی آخری شمع جس کی ضیا پاشیوں سے لاکھوں آنکھیں پرنور تھیں، ۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو بجھ چکی تھی۔ اس کس مپرسی اور بے کسی کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے اس منتشر قافلہ کی شیرازہ بندی کے لئے آپ کی ذاتِ گرامی کو چن لیا اور آپ کی نگہ دوربیں نے اس قافلے کو بتایا کہ ان کے گرد و پیش کس کس قسم کی خطرناک گھاٹیاں موجود ہیں۔ وہ گھاٹیاں کہ جن میں کہیں "متحدہ قومیت" کے دامِ ہمرنگِ زمین میں کبوترِ حرم کو پھانسنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں، کہیں کسی منبر سے یہ آواز آرہی تھی کہ قومیتیں مذہب سے نہیں اوطان سے بنتی ہیں[1] اور یوں اس طائرِ لاہوتی کے بال و پر کو غبار آلودۂ ارض و بوم بنا کرامتِ رسولؐ کافۃ للناس کو جغرافیائی حدود کی آب و گل میں محبوس کیا جا رہا تھا۔ کہیں "امرھم شوریٰ بینھم" کی حامل قوم کی نگاہوں میں مخلوط انتخاب کے سراب کو آبِ حیواں بنا کر دکھایا جا رہا تھا۔ کہیں اس "اولی الامر منکم" کی ماموربجماعت کے لئے غیر مسلموں کی امامت و قیادت کو عین دین قرار دیا جا رہا تھا۔ کہیں انگریز کے خلاف "متحدہ محاذ" کے طلسم سے کفار و مشرکین سے تولی کے جواز کے فتاویٰ شائع ہو رہے تھے۔ ایک طرف ایک مغنی آتشِ نفس سرودِ گاہو وار دھا کی مستعار لے میں یہ خواب آور گیت گا رہا تھا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ اس لئے اسلام کو کسی دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں۔ دوسری طرف کچھ خداوندانِ مکتب شاہین بچوں کے لئے اہمسا کی بازو شکن تعلیم کی اسکیمیں تیار کر رہے تھے[2] ہندو اپنے ذہن میں "رام راج" کے قیام کے منصوبے باندھ رہا تھا اور اس کے لئے انگریز سے شریفانہ معاہدے (GENTLEMAN'S AGREEMENT)

[1] ابوالکلام آزاد۔ [2] ڈاکٹر ذاکر حسین خان۔

استوار کر رہا تھا۔ ہندوؤں کے شور و غوغا سے متاثر انگریز بھی مسلمانوں کو بلا تامل ہندوؤں کے ہاتھ میں دے دینے پر آمادہ تھا کہ وہ اپنی ہزار سالہ غلامی کا جذبۂ انتقام اس کے خون سے ٹھنڈا کرے۔ جو لوگ اغیار کی صفوں میں کھڑے ہو کر ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی کا دعوے کر رہے تھے ان میں اتنا سمجھنے کی استطاعت بھی نہ تھی کہ بساطِ سیاست پر یہ آہنی مہرے کس طرح چلائے جا رہے ہیں۔ ہندو خوش تھا کہ میں نے دس کروڑ فرزندانِ توحید کو اچھوتوں کی صف میں ملا دیا۔ انگریز راضی تھا کہ وہ خنجرِ ہلال جس کے بے نیام ہونے کے خوف سے کلیجۂ صلیب میں ہمیشہ دھڑکن رہتی تھی، اسے گنگا کی لہروں میں بہا دیا گیا۔ کہ اس کسمپرسی کے عالم اور اس ظلمت و وحشت کے وقت آپ آگے بڑھے اور ہندوؤں اور انگریزوں کے ہر خفیہ منصوبے اور ہر پوشیدہ سازش کو ایک ایک کر کے بے نقاب کر دیا اور یوں ان کے تصورات کی حسین دنیا کو ایک خوابِ پریشاں میں تبدیل کر کے رکھ دیا اور ساری دنیا پر اس حقیقتِ عظمیٰ کو واضح کر دیا کہ

آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

بطلِ جلیل القدر!

ہمیں خوب احساس ہے کہ آپ کی منزل کس قدر کٹھن اور راستہ میں کس قدر مشکلات کا سامنا ہے۔ جہاں تک غیروں کا تعلق ہے مسلمان جیسی منتشر قوم کے مقابلہ میں ہندوستان اور برطانیہ کی دو بڑی قوتوں کا متحدہ محاذ ہی کچھ کم سنگِ گراں نہیں لیکن غیروں سے کہیں زیادہ جانگداز اور مہیب مشکلات خود اپنوں کی پیدا کردہ ہیں۔ ان "اپنوں" کو بھی چھوڑیئے جو محض اپنی سنہری اور روپہلی مصلحت کوشیوں کی خاطر نشرگاہِ واردھا (RADIO STATION) کے آلۂ مکبر الصوت (LOUD SPEAKERS) بنے ہوئے ہیں۔ وہ تو اس مخالفت پر مجبور ہیں لیکن سب سے زیادہ ماتم تو ان "مخلص منافقین" کا ہے جن کی رفاقت و حمایت بھی از پے تلبیس کہ

کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو

جن کا مقصدِ وحید اپنے طرۂ وجاہت کا قیام و بقا ہے۔ خواہ یہ آستانۂ خواجۂ اجمیر شریف سے وابستگی ظاہر کرنے سے حاصل ہو جائے یا لشکرِ بولہبی میں شمولیت سے۔ بایں ہمہ نہ ان عزیزوں کا ہجوم مخالفت ایسا ہے کہ اس سے کچھ خوف کھایا جائے اور نہ انہوں میں سے بعض کی نوازشہائے بیجا اور دوسروں کے طعنہ ہائے دلخراش ایسے کہ ان کا غم کھایا جائے۔ کہ جو حق پر ہو اسے کسی کی مخالفت کی کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔

رہے ہیں اور ہیں فرعون تیری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ تیری آستیں میں ہے یدِ بیضا

حریت مآبے!

ہمیں اس بات کا بھی علم ہے۔ کہ مسلمانوں کی موجودہ تگ و دوِ حیات میں جو نصب العین آپ کے سامنے ہے وہ وہی ہے جو ہر مسلمان کی نگاہوں کے سامنے ہونا چاہیئے جس کے دل میں بحیثیت مسلمان زندہ رہنے کی تڑپ اور اپنی نسلوں کو بحیثیت مسلمان رکھنے کی آرزو موجزن ہے اور سب کو معلوم ہے کہ وہ نصب العین ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (MUSLIN INDIA) کی تشکیل کے سوا اور کچھ نہیں۔ جس طرح آپ احوال و ظروف کا صحیح جائزہ لیتے ہوئے قدم بقدم اس درخشندہ نصب العین کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں وہ آپ کی بلند نگہی اور حسنِ تدبر کا آئینہ دار ہے۔ سطح بیں لوگوں نے آپ کو صرف ایک فاضل مقنن اور دیدہ ور مدبر کی حیثیت سے ہی پہچانا۔ لیکن جن لوگوں کو آپ کے قریب ہونے کی سعادت نصیب ہوتی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ

مبداِ فیض نے آپ کو اس قدر ذہنِ رسا کے ساتھ ساتھ کس قدر دلِ پرسوز و پُر درد کی نعمتوں سے نوازا ہے۔

خرد نے تجھ کو عطا کی نظرِ حکیمانہ　　سکھائی عشق نے تجھ کو حدیثِ رندانہ

اور قلب و نظر اور عقل و عشق کا یہی امتزاج ہے جو ایک ناخدائے کشتیٔ ملت کی متاعِ گراں بہا ہے۔

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز

یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

عالیمرتبت!

آپ یقین فرمایئے کہ جس قوم کی فلاح و بہبود آپ کی زندگی کا منتہا ہے، اس قوم کا سوادِ اعظم آپ کی قیادت و امارت پر کامل بھروسہ رکھتا ہے اور ان کی خاطر آپ نے جو گراں قدر قربانیاں کی ہیں، ان کے دل میں ان کا پورا پورا احساس ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ سرزمینِ پنجاب جو ملتِ اسلامیہ کے اس اجتماعِ عظیم کی تقریب پر آپ کی تشریف آوری سے سرفراز ہونے والی ہے اس میں آئینی نکتہ نگاہ سے (CONSTITUTIONALLY) ابھی پراونشل لیگ کا قیام بھی عمل میں نہیں آسکا لیکن ہمیں امید ہے کہ یہ حقیقت آپ کی نگاہ سے مستور نہ ہوگی کہ پنجاب کا ایک ایک قریہ، اور اس قریہ کے ایک ایک فرد کا دل آپ کی عظمت و عقیدت کا نشیمن بنا ہوا ہے۔ بس کسی ایک مردِ خود آگاہ و خدا دوست کے نعرۂ مستانہ کی دیر ہے کہ یہ طوفانِ بلا انگیز کسی کے روکے نہیں رُکے گا۔ اس وقت بچے گا وہی جو کشتیٔ ملت میں اخلاص و دیانت سے سوار ہوگا۔ اور پکارنے والا پکاریگا،

لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ۔

سیّد القوم!

ادارۂ طلوعِ اسلام جسے ہزارہا پُرخلوص اور صحیح النظر مسلمانوں کی ترجمانی کا فخر حاصل ہے اجلاس لیگ کی صدارت پر آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتا ہے اور مستدعی ہے کہ جس نصب العین کی طرف آپ کا قدم اٹھ رہا ہے قوم کو اس کی طرف اور تیزگامی سے بڑھاتے چلیئے۔ اس نصب العین کے حصول کے لئے اگر ضرورت پیش آئی تو آپ دیکھیں گے کہ قوم کس طرح کفن بر دوش و سر بکف آپ کی دعوت پر لبیک کہتی ہے۔

بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن

چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن"

~~~~~(۰)~~~~~

یہ سپاسنامہ اس قائد کی خدمت میں پیش کیا گیا جو ملتِ اسلامیہ کی راہ نمائی اس کی متعینہ منزل کی طرف کر رہا تھا۔ لیکن بعید از سپاس گذاری ہوتا اگر اس موقع پر ملتِ اسلامیہ کے اس محسنِ اعظم کی یاد تازہ نہ کرائی جاتی جس نے ملت کے لئے خود اس منزل کو متعین کیا تھا۔ اس مقصد کے پیشِ نظر، ذیل کی سطور بھی اسی پرچہ میں باعثِ ہزار فخر و مباہات شائع ہوئیں۔

"صبحِ امید"

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں

آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ　　(اقبالؒ)

ؔ علامہ اقبال ؒ
~~~~~

سنہ ۱۹۳۰ء کا ذکر ہے مسلمانوں نے ایک مدت کی گہری نیند کے بعد کروٹ لی تھی۔ ایک عرصہ کے منجمد خون میں کچھ کچھ روانی کے آثار محسوس ہو رہے تھے۔ ایک زمانہ کے جمود و تعطل کی برف کی سلیں حوادثِ زمانہ کی تمازت سے ذرا پگھلنی شروع ہوئی تھیں۔ ایک وحشت زا بیابان میں کھوئے ہوئے قافلے کے افراد کے دل میں اپنی متاعِ گم گشتہ کا کچھ نہ کچھ احساسِ زیاں پیدا ہو رہا تھا۔ لیکن فکر و نظر کی پریشانیوں کے باعث کوئی زندہ و پائندہ راہِ عمل نظر نہیں آتی تھی۔ پاؤں آمادۂ سفر تھے لیکن منزل کا کوئی پتہ تھا نہ نشانِ راہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ عوام تو ایک طرف کشتیِ ملت کے سپتہ کار ناخدا بھی عام طور پر مخلوط و جداگانہ انتخاب اور تخصیص نشست و نیابت کے سود و زیاں کے پیچ در پیچ مسائل میں الجھ رہے تھے۔ ان کے مطالبات مذہبی اور ثقافتی تحفظات کی حدود میں گھر کر رہ چکے تھے۔ اور ان کی نگاہیں جمہوری نظامِ حکومت کی بظاہر درخشندہ افق پر جا کر رُک چکی تھیں۔ بالعموم یہ وہ حضرات تھے جنہیں فطرت نے صرف "دانشِ برہانی" عطا فرمائی تھی۔ اور وہ دانش جو محض احوال و ظروف کے امیال و عواطف اور حوادث و واقعات کے تجارب و مشاہدات سے استنباطِ نتائج کے بعد ہی کسی فیصلہ پر پہنچا سکتی ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ لیکن اس محشر ستانِ انتشار و تشتت میں اللہ کا ایک ایسا بندہ بھی موجود تھا جسے مبداءِ فیض کی کرم گستری نے دانشِ برہانی کے ساتھ "دانشِ نورانی" کی متاعِ گراں بہا سے بھی سرفراز فرمایا تھا۔ یعنی وہ دانش جو قرآنِ کریم کے حقائق و معارف پر تدبر و تفکر سے ایک مردِ مومن کی نگاہوں میں وہ بصیرت پیدا کر دیتی ہے جس سے وہ ان نفسیاتی کیفیات کا مشاہدہ کر لیتا ہے جن سے اقوام و ملل کے مقدرات کے ستارے بنتے اور بگڑتے ہیں اور ان مشاہدات سے اس کے "آئینۂ ادراک میں" آنے والے دور کی ایک دھندلی سی تصویر نظر آ جاتی ہے۔ اس کی نگہِ دور رس آشیانہ کی نظر فریب پائیداری کے بجائے اس شاخ کی نزاکت پر ہوتی ہے جس پر وہ آشیانہ استوار ہوتا ہے۔ اس لئے وہ عام لوگوں کی طرح کبھی خوش آیند الفاظ کے سحر سے مسحور اور بلند آہنگ دعاوی کے شور سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اس کی نگاہ حقائق پر ہوتی ہے اور وہ ان ہی حقائق کی دوربین سے پردۂ افلاک کے پیچھے چھپے ہوئے حوادث کا نظارہ کرتا ہے۔

ہاں تو اس ہنگامہ زارِ انتشار و خلفشار میں یہ مردِ مومن جسے قسامِ ازل نے اس قسم کی روشن بصیرت سے نوازا تھا، اٹھا، قافلے کے چند بکھرے ہوئے افراد کو یکجا جمع کیا۔ اور کہا کہ آؤ! تمہیں بتاؤں کہ قرآنِ کریم نے تمہاری منزل کونسی متعین کر رکھی ہے۔ اور ہندوستان کے احوال و ظروف کے پیشِ نظر اس منزل تک پہنچنے کے لئے کون سی صراطِ مستقیم ہے۔ اس نے گرد و پیش کے حالات کا تجزیہ کیا اور اس کے بعد کہا کہ :-

اس سے ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان جیسے ملک میں ایک ہم آہنگ "کل" کی تشکیل کے لئے بلند سطح کی فرقہ پرستی بالکل ضروری اور ناگزیر ہے، برعکس یورپین ممالک کے ہندوستان میں جماعتی تشکیل کی بناء جغرافیائی حدود نہیں۔ ہندوستان ایک ایسا براعظم ہے جس میں مختلف النسل، مختلف اللسان، مختلف المذاہب انسانوں کی جماعتیں آباد ہیں۔ ان کے نظریۂ زندگی کی بناء کسی مشترک نسلی شعور پر نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ہندو بھی کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جس کے مختلف افراد میں فکر و نظر کی یکسانیت ہو۔ ہندوستان میں یورپین اصولوں کے مطابق جمہوریت کی تشکیل نہیں ہو سکتی جب تک یہاں مختلف فرقوں کی جداگانہ ہستی کو تسلیم نہ کر لیا جائے۔ لہٰذا مسلمانوں کا مطالبہ بالکل حق بجانب ہے کہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (MUSLIM-INDIA)

؎ تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہو گا (اقبالؒ)

کو معرضِ وجود میں لایا جائے۔ میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ ہندوستان کی حکومتِ خود اختیاری زیرِ سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر کچھ بھی ہو، مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار جذبے میں کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانوی راج قائم ہے (با وجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ سلوک نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخر الامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیوں سلجھانے گا..... یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انہیں بھی کہیں اپنے نشوو ارتقاء کا موقع ملے۔ اسلئے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدتِ قومی کے نظامِ حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو اربابِ سیاست اپنے ذہن میں لئے بیٹھے ہیں اور جس سے مقصدِ وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر انہیں کا غلبہ اور تسلط ہو..... "

(خطبہ صدارت حضرت علامہ اقبالؒ بتقریب سالانہ اجلاس مسلم لیگ الٰہ آباد منعقدہ ۱۹۳۰ء)

یہ ایک نئی آواز تھی جو ہندوستان کی فضا میں غلغلہ انداز ہوئی۔ یہ ایک انوکھا نصب العین تھا جو ہندی مسلمانوں کے سامنے رکھا گیا۔ نیا اور انوکھا اس لئے کہ مسلمان صدیوں کی غلامی سے یہ بھول ہی چکا تھا کہ قرآن کریم کی رُو سے ایمان و عمل صالحہ کا فطری نتیجہ استخلاف فی الارض ہے اور مسلمان دنیا میں صرف اس لئے زندہ ہے کہ وہ خدا کی اس وسیع و عریض زمین پر حکومتِ خداوندی قائم کرے۔ چونکہ یہ آواز کانوں کو بالکل نامانوس معلوم ہوئی، اسی لئے کسی نے اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ کسی نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ ایک شاعر کے عالمِ تصور کے حسین خواب ہیں۔ کوئی یہ سمجھ کر ہنس دیا کہ یہ ایک فلسفی کے طرفہ زا دماغ کی اُپج ہے جو ہندوستان کو ایک ملک نہیں بلکہ مجموعہ ممالک قرار دیتا ہے۔ جو یہاں کے باشندوں کو ایک قوم نہیں بلکہ مختلف اقوام کا مجموعہ خیال کرتا ہے۔ جو مسلمانوں کو ایک اقلیت نہیں بلکہ مستقل بالذات جداگانہ قوم گردانتا ہے۔ جو اس بیسویں صدی میں جمہوری نظامِ حکومت کو ہندوستان کے لئے ناقابلِ عمل ٹھہراتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو ہندوستان کے دو ٹکڑے کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مستقل طور پر حدِ فاصل قائم کرنا چاہتا ہے۔

اس نے یہ سب کچھ سنا اور ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو گیا۔ وقت گزرتا گیا۔ حالات بدلتے گئے اور ابھی دس برس بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ واقعات نے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ سیاستِ ہند کی گتھیوں کا حل سوائے اس کے اور کچھ نہیں جو ۱۹۳۰ء میں اس "دیدۂ بینائے قوم" نے پیش کیا تھا (رحمہ اللہ تعالےٰ)۔ آج یہ مسائل ایک ایک کر کے واضح اور بین طور پر سامنے آ چکے ہیں کہ ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ مجموعۂ ممالک ہے۔ مسلمان ایک فرقہ نہیں بلکہ جداگانہ قوم ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی کش مکش کا تصفیہ فرقہ وارانہ انداز پر نہیں بلکہ بین الاقوامی حیثیت سے ہو سکتا ہے۔ بناء بریں مغربی انداز کا نظامِ جمہوریت یہاں قابلِ عمل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ان امراض کا واحد علاج تقسیمِ ممالک ہے۔ آج اس کے لئے گوشے گوشے سے آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ مختلف اسکیمیں اور تجاویز پیش ہو رہی ہیں۔ ہر شخص اسی نہج پر سوچتا اور اسی طریقِ عمل کو جادۂ مستقیم سمجھتا ہے۔ حتیٰ کہ خود ہندوؤں کا وہ طبقہ جو اپنے آپ کو فریب میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتا، وہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ ہندی مسائلِ سیاست کا حل اس کے سوائے اور کچھ نہیں۔ مثلاً مسٹر این۔ سی۔ دت (سابق رکن آل انڈیا کانگریس کمیٹی) اپنے ایک مراسلہ میں لکھتے ہیں:-

" ان حالات میں میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم قضیہ کا حل یہی ہوگا کہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ

لیا جائے۔ اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے ساتھ ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے۔ مسٹر جناح نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے تعبیر کر کے جس خیال کا اظہار کیا ہے وہ میرے خیال میں اب نہیں تو کل حقیقت ہو کر رہیگا۔ بہرحال اگر یہ چیز بھی جلد طے ہو جائے تو کچھ بُرا نہیں۔ یوگوسلاویہ کے کروٹ اور سرب کی طرح اگر ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں میں بھی بحیثیت فرقے کے نہیں بلکہ بحیثیت دو قوموں کے سمجھوتہ ہو جائے اور مسلم اکثریت کے علاقوں میں ہندو اکثریت کے علاقے مداخلت نہ کریں۔ اور ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان مداخلت نہ کریں۔ تب ہی ہندوستان کا اجتماعی مفاد محفوظ رہ سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہ چاہیئے۔ البتہ اس میں مناسب ترمیم و اصلاح کر کے اسے اپنے حسب حال بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔" (مدینہ یکم فروری ۱۹۴۰ء)

اس میں شبہ نہیں کہ حوادث زمانہ کا ستایا ہوا مسلمان، ضعف عزیمت و شدتِ انتشار کی وجہ سے ہنوز اپنے بازوؤں میں وہ قوت محسوس نہیں کرتا جو ان چٹانوں کو ریت کے ذروں میں تبدیل کر دے، جو اس کی منزل کے راستے میں حائل ہیں۔ لیکن جب اس نے اپنا نصب العین متعین کر لیا ہے اور اس کے دل میں اپنے نصب العین تک پہنچنے کا عزم راسخ ہو چکا ہے تو ان عارضی حوادث و موانع سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آپ اسی نہج پر قدم اٹھاتے چلیے چند دنوں کے بعد آپ دیکھیں گے کہ توفیق ایزدی (اس مردِ راہ بیں علیہ الرحمتہ کے الفاظ میں)

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے"
(اقبال ۱۹۱۲ء)

(۴)

رام گڑھ

مارچ ۱۹۴۰ء میں ادھر یہ ہو رہا تھا اور ادھر رام گڑھ کے مقام پر کانگریس کے سالانہ جلاس کی کرسی صدارت سے راشٹر پتی ابو الکلام آزاد صاحب اعلان فرما رہے تھے کہ مسلمانوں کا دعویٰ آزادی غلط ہے، انہیں ہندوؤں کا غلام بن کر جینا ہوگا کیونکہ یہی اسلام کی تعلیم ہے۔ یہی قرآن کا ارشاد ہے۔ ادھر یہ دونوں اجتماعات لاہور اور رام گڑھ میں انعقاد پذیر تھے اور ادھر جبریل اور ابلیس اپنی آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے ہو رہے تھے۔ زمین اس بدبختی پر روتی تھی اور تقدیر اس پر ہنستی تھی۔ اپریل ۱۹۴۰ء کے طلوع اسلام میں جناب آزاد کے خطبہ صدارت پر ایک جامع تبصرہ شائع ہوا جس میں انہیں بتایا گیا کہ ان کا آج کا قرآن، ان کے تیس برس پیشتر کے قرآن سے کس قدر مختلف تھا!

(۵)

جہانِ نو

جب ملت اسلامیہ کے اجتماع لاہور نے اپنے مطالبہ کو متعین طور پر واضح کر کے اس کا اعلان کر دیا تو ضرورت تھی کہ اس مطالبہ کے مختلف گوشوں پر سیر حاصل بحث کی جائے اور اس کے ما علیہ و ما لہٗ پر بالوضاحت تنقید

تجربہ سے اچھوں اور بیگانوں کو بتا دیا جائے کہ یہ مطالبہ کیا ہے؟ کس لئے کیا گیا ہے؟ اور اس کے حصول کا طریق کیا ہوگا۔ اس کے لئے جون ۱۹۴۰ء کے رسالہ میں اسّی صفحات پر مشتمل ایک جامع مضمون بعنوان "جہانِ نو" شائع ہوا جس نے فی الواقعہ دنیا کو ایک "جہانِ نو" سے متعارف کرایا۔ اس سے پیشتر بہت کم لوگ تھے جنہیں یہ معلوم تھا کہ مسلمان اس مطالبہ پر کیوں مجبور ہے۔ اس سے حقیقی مقصود کیا ہے۔ اور یہ کہ اس "جہانِ نو" کے قیام سے کس طرح اس دنیائے کہن کا جہنم تسکین و طمانیت کی جنت میں تبدیل ہو جائے گا۔

———(۵)———

جمعیت علمائے ہند

۱۹۴۱ء میں لیگ کا سالانہ اجلاس مدراس میں منعقد ہوا۔ اور وہاں پاکستان کے نظریہ کو بنیادی قانون کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔ لیگ نے اب اپنا نصب العین ان الفاظ میں متعین کیا۔

> "مکمل آزاد ریاست کا استقرار، جو اس طرح متعین کی جائے گی کہ شمال مغرب اور شمال مشرق کے وہ علاقے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے مسلمانوں کے ہی نشین ہوں گے۔ ان کی حکومت میں کسی غیر کا عمل دخل نہ ہوگا۔"

پاکستان کا نظریہ اب آہستہ آہستہ خاورِ جہاں تاب کی درخشندہ شعاعوں کی طرح مطلع سیاست ہند پر چھائے جا رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ باطل کی ظلمتناکیاں چپکے چپکے دبے پاؤں پیچھے کو سرکتی جا رہی تھیں۔ اس تذبذب کا آئینہ دار وہ خطبۂ صدارت تھا جو جمعیت علمائے ہند کے اجلاس لاہور کی تقریب پر جناب حسین احمد مدنی صاحب نے ۱۹۴۲ء کے شروع میں ارشاد فرمایا۔ اس خطبہ میں علاوہ دیگر امور، اس حقیقت کو ابھار کر سامنے لایا گیا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو اقلیت تصور کر کے ان کے سیاسی مسائل کا حل نہیں سوچنا چاہیئے بلکہ انہیں ایک قوم کی حیثیت دینی چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا:۔

"ہندوستان کے داخلی مسائل میں مسلمانوں کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ گزشتہ ایک صدی سے ہندوستان میں برطانیہ کی حکمتِ عملی نے مسلمانوں کو بھی ہندوستان کی اقلیتوں میں داخل کر کے ان متعلقہ مسائل کو اقلیتوں کے مسائل سے وابستہ کر دیا ہے۔ برطانوی سیاسیین اور مدبرین ہمیشہ مسلمانوں کو ایک سیاسی اقلیت کی صف میں شمار کرتے اور ان کے معاملے کو اقلیتوں کے معاملات میں شامل کرنے کے عادی ہو گئے ہیں اور اسی بنا پر ہندوستان کی غیر مسلم قومیں بھی ہندوستان کے سیاسی مستقبل میں مسلمانوں کے متعلقہ مسائل کے ساتھ وہی سلوک کر رہی ہیں جو اقلیتوں کے مسائل سے سلوک کرنے والی ہیں۔ یہ خیال انگریزوں اور غیر مسلموں تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود مسلمانوں کے ایک طبقے کے دلوں میں بھی یہ احساس پیدا ہو گیا کہ وہ ہندوستان میں ایک سیاسی اقلیت ہیں اور اس وجہ سے وہ تمام اندیشے اندر موسے اور خطرات ان کے دلوں میں پیدا ہو گئے جو ایک اقلیت کو اپنی زندگی اور انفرادیت کے متعلق اکثریت کی طرف سے پیش آتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کی مجموعی مردم شماری میں تعداد کے لحاظ سے مسلمان بھی عددی اقلیت میں ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بجائے خود ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد یورپ کے کسی بڑے سے بڑے خطے کی آبادی سے کہیں زیادہ ہے۔ نیز ہندوستان کی تعمیر میں ان کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ ہندوستان میں ان کی تعداد نو اور دس کروڑ کے درمیان ہے۔ تہذیب اور ثقافت کے لحاظ سے وہ اہم خصوصیات کے مالک ہیں۔ جغرافیائی حیثیت سے انہیں قدرتی استحکام حاصل ہے۔ ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار میں وہ اکثریت رکھتے ہیں اور اگر صوبوں کی از سرِ نو تجدید اور توسیع کی جائے تو وہ نیز مجوزہ صوبوں میں سے چھ صوبوں میں اکثریت حاصل کر لیں گے۔ ان تمام حالات میں بھی اگر مسلمانوں کو ایک سیاسی اقلیت قرار دے کر دیگر اقلیتوں میں انہیں شامل کر دیا جائے تو اس سے زیادہ سیاسی غلطی اور کیا ہو سکتی ہے اور اس سے بڑا اور کیا فریب دنیا کو دیا جا سکتا ہے؟"

یہ رجحانات اس حقیقت کے غماز تھے کہ یہ حضرات اب کس طرح اپنے دل کی گہرائیوں میں ملتِ اسلامیہ کے دعاوی و مطالبات کو حق بجانب محسوس کرتے تھے۔ لیکن ہماری شوریدہ بختی کہ ان کے باوجود انہیں یہ جرأت نصیب نہ ہوئی کہ اس احساس کا کھلے بندوں اعتراف کر لیتے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو وہ قوم کی تمام توانائی جو باہمی مخالفت کے مقابلہ میں صرف ہوئی، کسی تعمیری مقصد کے لئے کام آتی اور آج اس کا مقام اس کے موجودہ موقف سے کہیں بلند ہوتا، لیکن ایسا نہ ہوا۔ اور یہ اتنا بڑا نقصان ہے جس کی تلافی ایک مدت میں جاکر ہو سکیگی۔

اسلامی مملکت کی خصوصیت

ان حضرات کا سب سے بڑا اعتراض یہ بھی تھا کہ مسٹر جناح امور دین سے واقف نہیں، اس لئے ارباب مذہب کے نزدیک ان کا پیش کردہ نصب العین درخور اعتنا نہیں ہو سکتا۔ اوّل تو اس صغریٰ و کبریٰ کی کڑیوں میں کوئی باہمی ربط نہ تھا۔ دیکھنا تو یہ تھا کہ جو نصب العین پیش کیا جا رہا ہے وہ غیر اسلامی ہے یا دین کے عین مطابق؛ لیکن انہی دنوں بعض چیزیں ایسی بھی سامنے آگئیں جن سے یہ حقیقت نمایاں ہو گئی کہ مسٹر جناح نے جس نظریہ کو صحیح سمجھا ہے وہ کس طرح دین کے مطابق ہے۔ ۱۹۴۶ء میں مسٹر جناح حیدر آباد تشریف لے گئے تو بعض نوجوانوں نے ان سے کچھ سوالات کئے۔ یہ مکالمہ شروع ۱۹۴۶ء میں اورینٹ پریس کی وساطت سے اخبارات میں شائع ہوا۔ اسے اپریل ۱۹۴۶ء کے طلوع اسلام میں نقل کیا گیا۔ وہ مکالمہ حسب ذیل تھا:-

سوال:- مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب:- جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورے کے مطابق میرا ذہن لامحالہ خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعوے ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

سوال:- اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت وغیرہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:- اشتراکیت، بالشویکیت، یا دیگر اسی قسم کے سیاسی اور معاشی مسلک دراصل اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا ربط اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

سوال:- ترکی حکومت تو ایک سیکولر سٹیٹ ہے۔ کیا اس سے اسلامی حکومت مختلف ہے؟ آپکا اس باب میں کیا خیال ہے؟

جواب:- ترکی حکومت پر میرے خیال میں مادی حکومت (SECULAR STATE) کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز، سو یہ بالکل واضح ہے۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کے لئے تعمیل کا مرکز قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور

شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے (آپ جس نوعیت کی بھی چاہتے ہوں) بہرحال آپ کو علاقہ اور سلطنت کی ضرورت ہے۔

سوال:۔ وہ سلطنت ہمیں ہند میں کس طرح نصیب ہو سکتی ہے ؟

جواب:۔ مسلم لیگ، اس کی تنظیم، اس کی جد و جہد، اس کا رُخ، اس کی راہ، سب اس سوال کے جواب ہیں۔

سوال:۔ جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریقِ کار، دونوں میں بہترین اور برترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں اور اجمالاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہاں وہ اپنے ذہنی میلانات اور تصورات زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار اور روبہ ترقی لا سکیں۔ تو پھر اس میں کونسا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جد و جہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کرتے ؟

جواب:۔ دقت یہ ہے کہ جب اس جد و جہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت بغیر اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت، تقسیم عمل اور اس کے اصل حدود کیا ہیں، ان امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے۔ اور اپنے حلقہ سے باہر، اہلیت و مستعدی کے باوجود مجھ میں یا آپ میں (یعنی کسی اور میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، انہیں میں ان مولوی صاحبان میں (الا ماشاء اللہ) نہیں پاتا۔ (اور پھر مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔ "

(۶)

نظریۂ پاکستان

اب پاکستان کا نظریہ عام ہو رہا تھا۔ ادھر اُدھر سے اس کی تائید میں آوازیں بھی اُٹھ رہی تھیں۔ چنانچہ اوائل ۱۹۴۴ء میں راجگوپال آچاریہ نے اپنا وہ فارمولا پیش کیا جس میں فی الجملہ اس نظریہ کو صحیح تسلیم کیا گیا تھا۔ پھر سر سٹیفورڈ کرپس آئے تو انہوں نے بھی اپنی تجویز میں اس کی طرف رجحان ظاہر کیا۔ لیکن یہ چیزیں صرف ہوا کا رُخ بتا رہی تھیں، کشتیٔ ملت کو ساحلِ مقصود تک پہنچانے کی اہلیت نہیں رکھتی تھیں۔ اس کے لئے ابھی اور جد و جہد و سعی و کاوش کی ضرورت تھی۔ یہ ہنگامہ اسی طرح سے گرم تھا کہ جنگ کی وجہ سے پیدا شدہ نامساعد حالات ہجوم کر کے امنڈ آئے اور طلوعِ اسلام کی اشاعت کا سلسلہ بعد مجبوری معرضِ التوا میں پڑ گیا۔

(۷)

گزشتہ اوراق میں جو کچھ آپ کی نظروں سے گزرا ہے وہ طلوعِ اسلام کے میدانِ سعی و عمل کے صرف ایک گوشے سے متعلق تھا۔ اس سے کہیں اہم وہ دوسرا گوشہ تھا جس کا اجمالی سا خاکہ اب آپ کے لئے وجہ تو راحتِ قلب و نگاہ ہو گا۔ گوشۂ اول ملتِ اسلامیہ کے اس مطالبہ کی تائید میں تھا جسے نظریۂ پاکستان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن طلوعِ اسلام کے نزدیک مسلمانوں کا یہ مطالبہ مقصود بالذات نہ تھا بلکہ ایک بلند و بالا مقاصد عظیم القدر کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اصل مقصود یہ تھا کہ ہم اپنی زندگی کو قرآنی خطوط پر متشکل کر سکیں اور چونکہ اس کیلئے کسی ایسے خطۂ ارض کا ہونا ضروری تھا جس میں کسی غیر کا دخل نہ ہو، اس لئے پاکستان کا حصول اس کے لئے لابدی تھا۔ اس کے سامنے یہ حقیقت واضح تھی کہ "زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب

نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کی ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ لہٰذا اس کے لئے ضروری تھا کہ حصول خطۂ ارض کی کوششوں کے ساتھ ساتھ نگاہوں کے سامنے وہ خاکہ بھی رکھتے چلے جائیں جس کے مطابق اس خطۂ زمین پر ایک جدید عمارت کی تعمیر ہونی تھی۔ یہ تھا طلوع اسلام کی مساعی کا دوسرا گوشہ۔ یوں تو طلوع اسلام کی ہر سطر اسی ایک منزل کی طرف دلیل راہ بنی تھی لیکن اس باب میں اہم مضامین کا ایک مستقل سلسلہ بھی جاری رہا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۳۸ء میں جناب پرویز کا ایک حقیقت کشا مضمون "اجتماعی زندگی" شائع ہوا جس سے اس سلسلہ کی ابتداء ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں علامہ اسلم جیراجپوری کا مضمون "اسلامی نظام" کے عنوان سے شائع ہوا جس میں قرآنی آئینِ حکومت و سیاستِ مدن کے بنیادی خط و خال سامنے آگئے۔ نومبر ۱۹۳۸ء میں اس اجمال کی تفصیل میں پرویز صاحب کا مضمون "مرکزیت" کے عنوان سے شائع ہوا۔ فروری ۱۹۳۹ء میں "اسبابِ زوالِ امت" کے موضوع پر علامہ اسلم صاحب کا ایک اہم مضمون شائع ہوا جس میں انہوں نے تاریخ و قرآن کی روشنی میں اس سوال کا جواب دیا جو ایک مدت سے ہر صاحب فکر کی توجہ کو مرکوز کئے ہوئے ہے کہ

ہیں آج کیوں ذلیل جو کل تک تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

اس باب میں سب سے اہم سوال جو اکثر سامنے آتا ہے یہی ہوتا ہے کہ قرآن جس قسم کے دولتی نظام کی تشکیل چاہتا ہے اسکے اصول و مبانی کیا ہونگے۔ اس موضوع پر مئی ۱۹۳۹ء کے طلوع اسلام میں جناب پرویز کا مضمون "خدا کی بادشاہت" شائع ہوا جس میں وضاحت سے بتایا گیا کہ دنیا میں قوت اور دولت کا غلط مصرف فسادِ آدمیت کا باعث ہوتا ہے، اور قرآن جس نظام کو دنیا میں وجہ شرفِ انسانیت قرار دیتا ہے اس میں قوت اور دولت کے غلط استعمال کا شائبہ تک باقی نہیں ہوتا اور احترامِ آدمیت کہ جو حقیقت مرجع ہے ہر قسم کے شرف و مجد کا، اس نظام کا بنیادی اصول قرار پاتا ہے۔

اسی سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ اس نظام میں غیر مسلموں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے گا؟ یہ سوال تحریک پاکستان کے سلسلہ میں خاص اہمیت رکھتا تھا کہ یہاں کی آبادی میں ایک نمایاں حصہ غیر مسلموں کا تھا۔ چنانچہ اس موضوع پر جون ۱۹۳۹ء کے پرچہ میں "اسلام اور مذہبی رواداری" کے عنوان سے جناب پرویز کا دوسرا اہم مقالہ شائع ہوا جس میں قرآنی نصوص اور تاریخی نظائر و شواہد سے اس حقیقت مستور کو بے نقاب کیا گیا کہ قرآنی نظام کے متعلق غیر مسلم مورخین نے دنیا کو کس قدر فریب میں مبتلا رکھا ہے اور اس طرح اس کے حسین چہرے کو کس قدر بھیانک عفریتی نقوش میں پیش کیا ہے۔

اکتوبر ۱۹۳۹ء میں پرویز صاحب کا عظیم القدر مضمون "مسلمان کی زندگی" شائع ہوا جس میں انہوں نے اپنے مخصوص دلکش انداز میں بتایا کہ مسلمان کی حقیقی زندگی کس قسم کی ہوتی ہے اور عجمی تصورات اور غیر قرآنی نظریات نے اسے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔

—— (۰) ——

اسلام نے جو اجتماعی نظام امت کے لئے تجویز کیا ہے اس کا مرکز کعبہ اور محیط تمام کرۂ ارض ہے۔ لیکن مسلمانوں نے جس طرح کعبہ کے مرکزی اجتماع کو محض ایک "یاترا" کی حیثیت دے رکھی ہے اس نے اس عظیم القدر اور مہتم بالشان نظام کو جسدِ بے روح بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس حقیقت کبریٰ کو واضح طور پر سامنے لانے کے لئے دسمبر ۱۹۳۹ء میں علامہ اسلم جیراجپوری کا پُر مغز مقالہ "حقیقت حج" شائع ہوا۔ اس کے بعد جنوری ۱۹۴۰ء کے پرچہ میں جناب پرویز کا مضمون "تمسک بالکتاب" شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ جس طرح مسلمانوں کی تمام حرکت و عمل کا مرکز کعبہ ہے اسی طرح ان کے آئین و ضوابط کا مرکز قرآن ہے۔

لیکن قرآن اسی صورت میں سمجھ میں آسکتا ہے جب اسے تمام انسانی تخیلات سے مبرا رکھا جائے۔ یہ انسانی تخیلات کن کن لطیف راہوں سے قرآن پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور انہوں نے عقیدت و عظمت کی مقدس نقاب اوڑھ کر کس طرح مسلمانوں کے دل کی گہرائیوں میں جگہ پکڑ رکھی ہے، اس کا تجزیہ جناب پرویز کے مبسوط مضمون "شخصیت پرستی" میں کیا گیا جس کی پہلی قسط مارچ ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی۔ اگست ۱۹۵۱ء میں ان ہی کا ایک اور مضمون "ختمِ نبوت" کے عنوان سے شائع ہوا جس میں "ایک آنے والے" کے مجوسی عقیدہ کی حقیقت کو بے نقاب کیا گیا۔

(۰)

عجمی تصوف کے ترکِ دنیا کے فلسفہ نے جب مسلمانوں کی زندہ اور زندگی بخش دنیا کو قبرستان میں تبدیل کر دیا، تو نہ اُن کے ذہنوں میں نُدرتِ افکار رہی نہ بازوؤں میں قوتِ تخلیق۔ دماغ، تقلیدِ جامد کی برفانی سِلوں سے مفلوج ہو گئے اور وہ آہنی پنجے جو پتھروں کے سینہ میں چھپی ہوئی چنگاریوں کو کھینچ کر اپنے قبضۂ قدرت میں لے آیا کرتے تھے، مصروفِ سبحہ شماری ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ان کی حالت یہ ہو گئی کہ دنیا اور اس سے متعلق تمام علوم و فنون کفار کا حصہ قرار پا گئے اور محکومی و محتاجی کی ذلیل زندگی کو "اللہ کی رحمت" قرار دے کر مسلمان نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ آخرت کی تمام سرفرازیاں ہمارا ہی حصہ ہیں۔ اس عجمی افسون کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے سامنے اس حقیقت کو واضح کیا جائے کہ قرآن نے علومِ طبیعی میں غور و فکر کرنے اور اشیائے کائنات سے نفع اندوز ہونے کی کس قدر تاکید کی ہے۔ اور جب قرآن کی صحیح تعلیم مسلمانوں کے سامنے تھی تو اس باب میں انہوں نے کس قدر تجسس و کاوش سے کام لیا تھا۔ اس موضوع پر جناب پرویز کا تحقیقاتی مقالہ "اسلام اور سائنس" مارچ ۱۹۵۱ء کے پرچہ میں شائع ہوا۔ اپریل ۱۹۵۱ء میں ان ہی کا ایک اور مضمون بعنوان "فردوسِ گم گشتہ" شائع ہوا جس میں انہوں نے بتایا کہ وہ جنتِ ارضی جس کے ہم بھی وارث تھے کس طرح ہماری نگاہوں سے گم ہو گئی اور اب اس کی بازیابی کی کیا صورت ہے۔

(۰)

برہمو سماجی تفسیر

ہندوؤں کو مسلمانوں سے کسی اور باب میں تو خطرہ نہیں تھا۔ اور جو خطرات تھے ان کے مقابلہ کی تیاریاں وہ سالہا سال سے کئے جا رہے تھے۔ لیکن ایک میدان ایسا تھا جس میں انہیں ان کی طرف سے خطرۂ حقیقی تھا اور مشکل بالائے مشکل یہ کہ اس خطرہ کے مقابلہ کا کوئی سامان ان کے پاس موجود نہ تھا۔ یہ میدان مذہب کا تھا۔ انہیں خطرہ تھا کہ اگر مسلمانوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کر دی تو ہندومت اس کے مقابلہ میں ایک لمحہ کے لئے بھی ٹھہر نہیں سکے گا۔ یہ خطرہ ان کے لئے ہر وقت باعثِ سوہانِ روح تھا۔ اس کی روک تھام کے لئے "مہاتما" گاندھی نے اس فلسفہ کا پرچار شروع کیا کہ دنیا میں تمام مذاہب یکساں ہیں۔ کسی ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ مطلب واضح ہے کہ اگر ہندومت اتنا بلند نہیں ہو سکتا کہ اسلام کی سطح تک پہنچ جائے تو اسلام کو اس کے مقام سے نیچے اتار کر ہندومت کی سطح پر رکھ دیا جائے۔ لیکن گاندھی جی اس حربہ کے کمزور پہلو سے خوب واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے کہنے سے مسلمانوں پر اس کا اثر کچھ نہیں ہوگا کہ اسلام اور ہندومت ایک جیسے مذہب ہیں۔ اس کمی کو "مولانا" ابوالکلام صاحب آزاد کی برہمو سماجی تفسیر (ترجمان القرآن) نے پورا کر دیا جس میں مختلف انداز سے اس چیز کو ابھارا گیا کہ "عالمگیر صداقتیں تمام مذاہب میں یکساں ہیں"۔ یہ خطرہ بہت دور رس تھا۔ اس لئے کہ جناب آزاد مسلمانوں میں ایک عالمِ قرآن کی حیثیت سے متعارف ہو چکے تھے اور ان کے الفاظ کا جادو مسلّم تھا۔ اس سحرِ سامری کی شکست و ریخت جناب پرویز کا ایک مدلل اور مسکت مضمون "کیا مذاہب یکساں ہیں" اگست ۱۹۵۱ء کے پرچہ میں شائع ہوا جس نے اس طلسم کی عنکبوتیت کو بے نقاب کر کے رکھ دیا۔

اس کے بعد اکتوبر اور دسمبر میں ان کے اور اہم مضامین "نجات کا قرآنی نظریہ" اور "نظریۂ ارتقاء اور قرآن کریم" شائع ہوئے۔ اپریل ۱۹۴۰ء میں ان کا ایک اور مضمون بعنوان "بچی آنکھ اور قرآن کریم" شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ قرآن کی شمع نورانی پر غیر اسلامی تصورات کے رنگین فانوس کس کس انداز سے چڑھائے گئے ہیں۔

(۸)

اس مختصر سے تعارف سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ ہنگامی سیاست پر تنقید و تبصرہ کے ساتھ ساتھ طلوعِ اسلام نے ملت کی نگاہ کو صحیح تعمیر کے لئے کیا کچھ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مضامین میں سے ایک ایک مضمون، اپنی جگہ ایک کتاب کی حیثیت رکھتا تھا۔ ادارۂ طلوعِ اسلام نے اس کا التزام کیا ہے کہ ان تمام مضامین کو الگ کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے کیونکہ ان کی افادیت ہنگامی اور عارضی نہیں مستقل ہے۔

(۹)

اس مقام پر اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی کا ذکر بھی غیر محل نہ ہوگا۔ اگرچہ اس کا تعلق براہِ راست طلوعِ اسلام سے نہیں لیکن بالواسطہ اس سے تعلق ضرور ہے۔ جناب پرویز کے مضامین جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے، درحقیقت ان کے تدبر فی القرآن کے منتشر اجزاء تھے۔ انکے اس تدبر کی مستقل صورت وہ عظیم القدر کتاب ہے جو "معارف القرآن" کے نام سے وجۂ فروغِ ابصار ہوئی۔ اس کتاب کی پہلی جلد کی اشاعت کا فخر طلوعِ اسلام کو حاصل تھا جو ۱۹۴۱ء میں شہود ہوئی۔ اس کے بعد اس مبسوط اور اہم تصنیف کی دو جلدیں اور شائع ہوئیں اور اب چوتھی جلد کی کتابت ہو رہی ہے۔ اس کتاب کا تفصیلی تعارف کسی دوسری فرصت میں کیا جائے گا۔ اس وقت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا کہ قرآن کی صحیح تعلیم کو سمجھنے کے لئے دنیا کی کسی زبان میں اس کتاب کی نظیر نہیں مل سکتی۔ ہمیں جناب پرویز کی کرم گستری سے امید ہے کہ اس سلسلہ کی بقایا کڑیوں کی اشاعت کا فخر ادارۂ طلوعِ اسلام کو ارزانی فرمایا جائے گا۔[1]

مدار جلوہ دریغ از دلم کہ حسن حسن
بہ خوشہ چینیِ آئینہ کم نمی گردد

(۱۰)

طلوعِ اسلام کا حصۂ نثر تھا۔ حصۂ نظم میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس کی خصوصیت کو برقرار رکھنے کا انتظام کر دیا اور اس طرح اس کی تہی دامنی کی تلافی کر لی۔ طلوعِ اسلام پیامِ اقبالؒ کے نشر و اشاعت کا ذریعہ تھا۔ اس پیامِ حیات آفریں کو نظم کے حسین پیکر میں پیش کرنے کا شرف مبدءِ فیض نے جناب اسد ملتانی کے لئے مقدر کر رکھا تھا۔ اور جناب اسدؔ کی گہرباریوں کو طلوعِ اسلام کے لئے وقف۔ جناب اسدؔ کی شاعری میں جوش و امید اور بصیرت و ایقان کی وہ تمام خصوصیات موجود ہوتی ہیں جو ایک حقیقی اسلامی شاعر کے کلام میں ہونی چاہئیں۔ طلوعِ اسلام اپنی خوش بختی پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے کہ اس کا کوئی شمارہ بھی جناب اسدؔ کی فیض بخشیوں سے محروم نہ رہا۔[2] فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

(۱۱)

---

[1] معارف القرآن کا یہ سلسلہ حسبِ ذیل کڑیوں سے تکمیل تک پہنچا ہے۔ (۱) ابلیس و آدم۔ (۲) جوئے نور۔ (۳) برقِ طور۔ (۴) شعلۂ مستور۔ (۵) من و یزداں۔ (۶) معراجِ انسانیت۔ (۷) اسلام کیا ہے؟۔ (۸) جہانِ فردا۔ (۹) کتاب التقدیر۔

[2] جناب اسدؔ تشکیلِ پاکستان کے بعد مرحوم ہو گئے۔ طلوعِ اسلام

[3] حسن مآب۔

گذشتہ اوراق میں ان احوال و کوائف کا اجمالی سا تذکرہ آپ کے سامنے آگیا۔ جو ۱۹۳۶ء سے اوائل ۱۹۳۸ء تک مسلمانانِ ہندوستان کی بساطِ سیاست پر رونما ہوئے۔ اور ان کے ساتھ ہی ان مساعی کا مختصر سا تعارف بھی ہو گیا جو اس باب میں طلوعِ اسلام کی طرف سے وجود کوشش ہوئیں۔ جون ۱۹۳۸ء کے بعد طلوعِ اسلام کی اشاعت میں التوا ہو گیا۔ اس کے بعد اس وقت تک جو ایسے اہم واقعات و حوادث ملک میں رونما ہوئے جن سے ملتِ اسلامیہ کی سیاسی زندگی بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہوئی ان کا اجمالی سا تذکرہ آئندہ اوراق میں آپ کے سامنے آجائے گا۔[1] اور اس طرح آپ کے سیاسی فکر میں وہ تسلسل قائم ہو جائے گا جو مستقبل کے متعلق سوچ بچار کرنے کے لئے ضروری ہے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

---

[1] اور یہ اس سلسلہ کی اگلی کڑی ہو گی۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور

ہر اتوار —— ۹ بجے صبح

بمقام: ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور۔

ملتان

بروز جمعہ —— (بذریعہ ٹیپ) —— بعد نماز مغرب

بمقام: شاہ محمد اینڈ سنز۔ بیرون پاک گیٹ۔

لائلپور

بروز جمعہ —— (بذریعہ ٹیپ) —— ۴ بجے شام

بمقام: دفتر بزم طلوع اسلام۔ راجہ چوک۔ ریل بازار۔ لائلپور۔

راولپنڈی

بروز جمعہ —— (بذریعہ ٹیپ) —— ۴½ بجے شام

بمقام: جی-۱۶۶- لیاقت روڈ (مری روڈ) راولپنڈی

کراچی

ہر اتوار —— ۹½ بجے صبح —— (بذریعہ ٹیپ)

بمقام: دفتر بزم طلوع اسلام

۱۱/۳ فردوس مارکیٹ۔ (بالمقابل بس سٹاپ) پہلے چورنگی۔ ناظم آباد کراچی ۱۸

اعلان

ماہنامہ طلوع اسلام ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں سپرد ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ اگر کسی خریدار کو پرچہ وقت پر نہ ملے تو اس کی اطلاع ادارہ میں ۱۵ تاریخ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے۔ تاکہ تعمیل کی جا سکے۔

اطلاع پندرہ تاریخ کے بعد موصول ہونے کی صورت میں

پرچہ قیمتاً ارسال ہو گا۔

خط و کتابت میں سالانہ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔

ناظم

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے

کسی قوم کی یہی بدقسمتی نہیں ہوتی کہ اس میں ایسے لوگوں کا فقدان یا کمی ہوتی ہے جن میں خلوص، ایثار، دیانت، جذبۂ عمل اور جوشِ کردار ہو۔ اس کی اس سے بھی بڑی بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ جن لوگوں میں یہ تمام خوبیاں اور صلاحیتیں موجود ہوں، وہ کسی غلط فہمی یا خود فریبی کی بنا پر، انہیں ایسے کاموں میں صرف کریں جن کا کوئی تعمیری نتیجہ مرتب نہ ہو۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے ذہن سے (اکثر اوقات نہایت نیک نیتی سے) ایک مقصد متعین کرتے ہیں اور پھر اس کے حصول کے لئے اپنی تمام توانائیاں اور صلاحیتیں اس طرح صرف کرتے ہیں گویا ان کی زندگی کا کوئی اور نصب العین ہے ہی نہیں۔ وہ اسی کی خاطر جیتے ہیں اور اسی کی خاطر مرنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ قرآن کریم کے الفاظ میں يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا۔ وہ اپنے دل میں سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔ لیکن ان کی اس ساری تگ و تاز اور سعی و کاوش کا کوئی تعمیری نتیجہ مرتب نہیں ہوتا فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ۔ ان کا کیا کرایا سب رائگاں جاتا ہے۔ کسی قوم کی اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے؟ مسلمان اس وقت اسی دوہری بدقسمتی کا شکار ہے۔ اس بدنصیب قوم میں جذبۂ صادقہ اور جوشِ عمل بالعموم مفقود ہے۔ اور جہاں یہ خوبیاں موجود ہیں وہ ایسے کاموں میں صرف ہو رہی ہیں جن کا کوئی تعمیری نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔ یہ لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم بہت بڑا جہاد کر رہے ہیں حالانکہ یہ "جہاد" کشمکشِ حیات سے گریز اور حقائقِ زندگی سے فرار کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

آپ نے تبلیغی جماعت کا نام سنا ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عوام میں "کلمہ سیدھا کرنے والوں" کے نام سے متعارف ہیں۔ آپ نے اس جماعت کا نام تو سنا ہوگا لیکن آپ کو غالباً اس کا علم نہیں ہوگا کہ یہ جماعت کتنی بڑی ہے۔ اس کی تنظیم ملک گیری نہیں، عالمگیر ہے۔ اس کے اجتماعات کس قدر محیط کل ہوتے ہیں ——— اور یہ کہ پاکستان میں اس کا مرکز ایک غیر معروف سا قصبہ ہے جسے رائے ونڈ کہتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ یہ جماعت اپنے متعلق کسی پبلسٹی کی قائل نہیں۔ لیکن اس دفعہ ان کے سالانہ اجتماعات کی روئداد اخبارات میں شائع ہوئی ہے جس کی چند ایک جھلکیاں ہم قارئین طلوعِ اسلام کے سامنے لانا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے روزنامہ نوائے وقت (لاہور) کا ۱۲ ستمبر کا پرچہ ہے جس سے یہ روئداد مقتبس ہے۔

ڈیڑھ لاکھ کا مجمع

روزنامہ لکھتا ہے: ٹیلیویژن، ریڈیو، اشتہار بازی اور تعلقاتِ عامہ کے موجودہ دور میں اگر کسی جگہ سو افراد بھی اکٹھے ہو کر کسی قسم کا جلسہ یا اجلاس منعقد کریں تو دور دور تک اس کی کارروائی کی رپورٹ پہنچ جاتی ہے لیکن لاہور سے بیس بائیس میل کے فاصلہ پر واقع قصبہ رائے ونڈ میں ہر سال ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ مسلمانوں کا اجتماع نہ صرف مسلمانوں کے اتحاد کی منہ بولتی تصویر ہے بلکہ موجودہ دور کے تعلقاتِ عامہ اور ابلاغِ عامہ کے ذرائع سے کسی قسم کی مدد لئے بغیر اتنے بڑے

اجتماع کا انعقاد پروپیگنڈہ کے ماہرین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ اس سالانہ اجتماع کے انعقاد کے انتظامات اور تاریخوں کا اعلان کسی اخبار میں نہیں کیا جاتا اور نہ ہی کسی قسم کے پوسٹر شائع کئے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں اس جماعت کے پھیلے ہوئے شیدائی جماعت کی ہائی کمان کے ہر اقدام سے پوری طرح باخبر رہتے ہیں۔"

تاسیس و مقاصد

اس جماعت کی تاسیس اور مقاصد سے متعلق لکھا ہے۔

"وہ مولانا محمد الیاسؒ سہارنپوری تھے جن کے مرشد رشید احمد گنگوہیؒ برصغیر کے معروف محدث تھے۔ اس تحریک کا احیاء کیا اور میوات میں بستی نظام الدین کے مقام پر اس کا مرکز قائم کر کے وہاں پر سالانہ اجتماعات کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے اس تحریک کو اس طرح منظم کیا کہ مسلمان جہاں کہیں بھی تھے تبلیغی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ سکول کے اساتذہ سکول میں، ملازم پیشہ افراد اپنی ملازمت کے دوران میں تبلیغ کے کام میں مگن ہو گئے۔ جو لوگ بولنے کا ملکہ رکھتے تھے انہیں پند و نصائح اور وعظ کرنے کے لئے گاؤں گاؤں اور شہر شہر بھیجا گیا۔ مساجد کو خاص طور پر اس تحریک کا مرکز بنا دیا گیا اور یوں یہ تحریک سیاسی پیچیدگیوں اور آلائشوں سے بچتی ہوئی پھیلتی چلی گئی۔ مولانا محمد الیاسؒ کی صدارت میں ۲ راگست ۱۹۴۷ء کو قصبہ نوح (میوات) میں ایک اجتماع ہوا جس میں صرف چیدہ چیدہ علماء، علاقے کے ذیلداروں اور نمبرداروں نے شرکت کی۔ وہاں پر پہلی بار اس جماعت کو ایک منظم حیثیت دی گئی۔ اس موقع پر فیصلہ کیا گیا کہ تبلیغی کاموں کے لئے ہر مسلمان کو قائل کیا جائے اور درج ذیل امور کی پابندی کا عہد کیا جائے۔ (۱) کلمۂ طیبہ کا صحیح یاد کرنا۔ (۲) نماز کی پابندی۔ (۳) تعلیم حاصل کرنا اور اس کی اشاعت۔ (۴) اسلامی وضع قطع رکھنا۔ (۵) اسلامی رسم و رواج کا اختیار کرنا اور شرک کی رسموں سے پرہیز کرنا۔ (۶) عورتوں میں پردہ کی پابندی۔ (۷) اسلامی طریقہ کے مطابق نکاح کرنا۔ (۸) عورتوں میں اسلامی لباس کا رواج۔ (۹) اسلامی عقیدہ سے نہ ہٹنا اور کسی غیر مذہب کو قبول نہ کرنا۔ (۱۰) باہمی حقوق کی نگہداشت کرنا۔ (۱۱) ہر جلسہ اور اجتماع میں ذمہ دار حضرات کا شریک ہونا۔ (۱۲) دینی تعلیم کے بغیر بچوں کو دنیوی تعلیم نہ دینا۔ (۱۳) دین کی تبلیغ کے لئے محنت اور کوشش کرنا۔ (۱۴) پاکیزگی و طہارت کا خیال رکھنا۔ (۱۵) ایک دوسرے کی عزت و آبرو کی حفاظت کرنا۔

ان تمام امور کو تبلیغ کرنے والوں کے لئے ضروری قرار دیا گیا اور اس وقت صحیح معنوں میں اسے اس تنظیم کا حلف نامہ قرار دیا۔"

مطالبات

اس جماعت کے شرکاء سے حسب ذیل مطالبات کئے جاتے ہیں:

"اس ضمن میں ہر شخص کے سامنے کچھ مطالبات رکھے گئے جن میں کہا گیا کہ ساری زندگی میں کم از کم چار ماہ، سال میں کم از کم ۴۰ دن اور ہر ماہ تین دن صرف تبلیغی کام میں صرف کئے جائیں۔ اس طرح ہفتہ میں دو بار گشت لگا کر لوگوں کو دعوتِ اسلام دینا۔ ۲۴ گھنٹوں میں ایک گھنٹہ دینی کام کرنا اور صبح و شام تلاوت کرنا بھی ضروری قرار دیا گیا۔ جمعرات کی شام کو اپنے نزدیکی اجتماع میں شرکت کرنا بھی ضروری قرار دیا گیا۔

اس کے لئے یہ بھی طے پایا کہ جو شخص تبلیغی کام کے لئے تیار ہو وہ کھانے پینے اور کرایہ کا خرچ خود برداشت کرے اور اگر استطاعت ہو تو اپنے نادار ساتھیوں پر بھی خرچ کرے۔"

موجودہ تنظیم

"مولانا محمد الیاسؒ کے انتقال کے بعد ان کے فرزند مولانا محمد یوسف ان کے جانشین مقرر ہوئے اور انہوں نے دعوت و تحریک کو برصغیر پاک و ہند کی حدود سے نکال کر ایک عالمگیر تحریک بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس تحریک کے مراکز دنیا کے تقریباً ۸۵ ممالک میں قائم ہو چکے ہیں، ماسوائے روس اور جاپان کے۔ اس جماعت کے تبلیغی وفود دنیا کے ہر کونے سے آتے ہیں۔ خصوصاً حج کے موقعہ پر دنیا بھر سے آئے ہوئے مسلمانوں کو تبلیغی کاموں پر آمادہ کرنے کے لئے

تبلیغی جماعت کے چیدہ چیدہ ارکان ہر سال اپنی کوششیں جاری رکھتے ہیں۔

تقسیمِ ملک کے بعد میوات کے ان چیدہ چیدہ مسلمانوں کی اکثریت چونکہ رائے ونڈ میں آکر آباد ہوئی اس لئے رائے ونڈ کو تبلیغی کاموں کا مرکز چن لیا گیا۔ آج رائے ونڈ کا نام پوری دنیا میں مشہور ہو چکا ہے۔ اس جگہ کا انتخاب اس لئے بھی موزوں رہا کہ یہ بڑے شہروں سے دور ہونے کی وجہ سے تمام ہنگاموں سے الگ تھلگ ہے اور رائے ونڈ کے تبلیغی جماعت کے میاں جی عبداللہ نے اس سلسلہ میں اپنی اراضی بھی پڑاؤ، خیموں اور مساجد کے لئے وقف کر دی۔

اس وقت ملک کے گوشہ گوشہ اور ۴۳ بیرونی ممالک سے آئے ہوئے مسلمانوں کے وفود کو دیکھ کر یہ خیال گزرتا ہے کہ ہم کسی ایسی مسجد میں پہنچ گئے ہیں یا ایسی خانقاہ میں ہیں جہاں پر ۲۴ گھنٹے لوگ عبادت میں مصروف ہیں۔ ہر شخص اپنا بستر اور کھانے پینے کے برتن ساتھ لایا ہے۔ جو نہیں لائے انہیں چٹائیاں مل جاتی ہیں اور کھانا لنگر سے معمولی معاوضہ کے بدلے مل جاتا ہے۔ مغربی پاکستان کی طرح مشرقی پاکستان میں بھی تبلیغی جماعت کی جڑیں بہت مضبوط ہیں۔ ہر تحصیل میں جماعت کا ایک امیر ہوتا ہے اور ہر ضلع میں ایک ضلعی امیر نامزد کیا جاتا ہے۔ اسی طرح صوبائی سطح پر الگ الگ امیر ہوتے ہیں جو اپنے اپنے علاقوں میں تبلیغ کے کاموں کا بیڑہ اٹھاتے ہیں۔ جماعت کے ارکان کسی سے چندہ یا فیس وغیرہ کے طور پر کسی قسم کا روپیہ پیسہ وصول نہیں کرتے۔"

(۲)

آپ اس جماعت کی تنظیم، جذبۂ عمل، ایثار اور اپنے پیشِ نظر پروگرام کی تکمیل کے لئے جذب و انہماک کو دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ اگر اس قسم کی جماعت کے سامنے دین کا صحیح مفہوم اور اس کا متعین کردہ بلند مقصد ہو تو یہ کتنا بڑا انقلاب پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن اب اس تمام تگ و تاز کا ماحصل اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ کچھ لوگ کلمہ اور نماز کا صحیح تلفظ ادا کرنے لگ جائیں یا نماز کے عادی ہو جائیں۔ ہمارے پیشِ نظر تو (خدانکردہ) کلمہ اور نماز کی صحتِ تلفظ کی تحقیر ہے اور نہ ہی ادائیگی نماز کی تنقیص۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ یہ چیزیں مقصود بالذات نہیں، دین کے بلند مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ اگر مقصد نگاہوں سے اوجھل ہو جائے، اور ذرائع ہی کو مقصودِ حیات سمجھ لیا جائے تو اس کا نتیجہ "حبطِ اعمال" کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اقبالؔ کے الفاظ میں۔

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علمِ لاہوتی ——— حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے یہ سرود ——— تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

قرآن کریم نے اقامتِ صلوٰۃ کے جو عملی اور محسوس نتائج بتائے ہیں ان کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ صلوٰۃ صرف نماز کا نام نہیں، یہ امت کا اجتماعی نظام ہے جو زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ مساجد میں اجتماعِ صلوٰۃ، اسی محیطِ کلی نظام کی ایک محسوس شکل ہے۔ لیکن قرآن کریم کی اس قسم کی آیات تو ہر ایک کے سامنے ہیں جن میں (مثلاً) کہا گیا ہے کہ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ۔ تباہی ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نماز کی غرض و غایت اور مقصود و مطلوب سے غافل رہتے ہیں۔ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ۔ (۱۰۷) جو نماز کے محسوس اور ظاہری ارکان کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے کے بعد سمجھ لیتے ہیں کہ ہم اس فریضہ کی ادائیگی سے فارغ ہو گئے، حالانکہ ان کی زندگی کی عملی روش کا یہ عالم ہوتا ہے کہ رزق کے ان سرچشموں پر جنہیں ہر ایک کے لئے کھلا رہنا چاہیئے، بند لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ رزق کے سرچشموں کا ہر ایک کے لئے کھلا رہنا ایک اجتماعی نظام ہی میں ممکن ہے جو صلوٰۃ کا فطری نتیجہ ہے۔ برعکس اس کے ان حضرات کے نزدیک "نماز کی عظمت" کیا ہے، اس کا اندازہ اس غلط فہمی سے لگایا جا سکتا ہے جسے یہ حضرات آجکل تعلیم کر رہے ہیں۔ اس

میں کہا گیا ہے کہ "علماء اور صوفیائے کرام کی زندگی سے کئی ایک ایسے واقعات ملتے ہیں جو باجماعت نماز کی عظمت اور بزرگی کا بھرپور احساس دلاتے ہیں"۔ اس کے بعد اس میں حسب ذیل قصہ درج ہے :-

"محمد بن ابن سماعہ ایک متقی بزرگ عالم تھے جو امام ابو یوسف کے شاگرد تھے۔ ان کا معمول تھا کہ مسلسل ۴۰ برس تک دو سو رکعت نفل نماز روزانہ پڑھتے رہتے۔ انہوں نے فرمایا کہ ایک مرتبہ کے علاوہ میری تکبیرِ اولیٰ کبھی فوت نہیں ہوئی وہ بھی اس وقت جب میری والدہ فوت ہوگئیں۔ میں نے اس وجہ سے کہ جماعت کی نماز کا ثواب ۲۵ درجہ زیادہ ہوتا ہے، اس نماز کو ۲۵ مرتبہ پڑھا تاکہ وعدہ پورا ہو جائے۔ اس رات خواب میں دیکھا کہ ایک شخص کہہ رہا تھا۔ تو نے پچیس دفعہ نماز تو پڑھ لی مگر ملائکہ کی آمین کا کیا ہوگا"۔ ملائکہ کی آمین کا مطلب یہ ہے کہ جب امام سورۂ فاتحہ کے بعد آمین کہتا ہے تو ملائکہ بھی ہمکلام ہوتے ہیں۔ جس شخص کی آمین ملائکہ کے ساتھ ہو جاتی ہے اس کے پچھلے سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔"

اس قصہ میں (علاوہ دیگر امور) آپ غور فرمایئے کہ جو شخص فرض نمازوں کے علاوہ دو سو رکعت نفل نماز روزانہ پڑھتا ہو اسے زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کوئی وقت بھی مل سکتا ہے؟ سوچئے کہ اگر ان حضرات کی تبلیغ و تلقین سے قوم یہی مسلک اختیار کر لے ــــ یعنی ہر شخص دو سو نفل روزانہ پڑھنے لگ جائے ــــ تو یہ زندہ کتنے دن رہ سکتی ہے؟ اسی پمفلٹ میں نماز باجماعت کی فضیلت کے سلسلہ میں اس قسم کی روایات بھی درج ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ :

"میرا دل چاہتا ہے کہ چند جوانوں سے کہوں کہ بہت سی لکڑیاں اکٹھی کر کے لائیں۔ پھر میں ان لوگوں کے پاس جاؤں جو بلا عذر گھروں میں نماز پڑھتے ہیں اور جا کر ان کے گھروں کو جلا ڈالوں۔"

آپ سوچئے کہ اس قسم کی روایات سے (جو ظاہر ہے کہ وضعی ہیں) حضورؐ رحمۃ للعالمین کی سیرتِ طیبہ کا کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے؟ یہ ہے ان حضرات کی تبلیغی کاوشوں کا ماحصل!

کہہ دیا جائے گا کہ ان لوگوں کی نیت تو نیک ہوتی ہے۔ لیکن بظاہر ہے کہ محض نیت کا نیک ہونا کسی عمل کے صحیح ہونے کی ضمانت نہیں ہو سکتا۔ دیہات کی عورتیں بچے کو سلانے کے لئے افیون کی انگلی چٹا دیتی ہیں۔ وہ ایسا نہایت نیک نیتی سے کرتی ہیں۔ لیکن فطرت افیون کے زہریلے اثرات کو اس لئے تریاق نہیں بنا دیتی کہ افیون چٹانے والی ماں کی نیت بڑی نیک تھی۔ افیون اپنا مہلک اثر کر کے رہتی ہے۔ اور پھر آپ دیکھئے کہ مذہب کی دنیا (یا مذاہب عالم) میں جس قدر باطل پرستیاں، غلط رسومات، توہمات و خرافات، نہایت عقیدت مندانہ انداز سے بجا لائی جاتی ہیں۔ ان میں ان پرستاروں کی نیت ہمیشہ نیک ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود قرآن کریم ان کی سخت مذمت کرتا ہے۔ ہندو سادھوؤں کی جانکاہ ریاضتیں اور عیسائی (SAINTS) کی اذیت انگیز مشقتیں، سب حسنِ نیت پر مبنی ہوتی ہیں۔ قرآن مسلکِ رہبانیت (خانقاہیت) کے متعلق کہتا ہے کہ ان لوگوں نے اسے رضا جوئی خداوندی کی نیت سے وضع کر لیا تھا، لیکن چونکہ وہ مسلک باعثِ ہلاکتِ انسانیت تھا اس لئے غلط تھا۔ لوگ نہایت نیک نیتی سے اپنے بچوں کو بتوں کے استھانوں اور پیروں کے مزارات پر ذبح کر دیتے ہیں۔ اس سے ان کا یہ عمل نیک تو نہیں ہو جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دین اور مذہب میں فرق ہی یہ ہے کہ دین میں اعمال ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتے ہیں اور مذہب میں وہ محض رسوم بن کر رہ جاتے ہیں حالانکہ ان رسوم کو ادا کرنے والوں کی نیت میں کسی کو شبہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ ۖ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ - (۵۳/۳۲) تم خود ہی

نہ سمجھ لیا کرو کہ تمہارا تزکیہ نفس ہو رہا ہے۔ اس کے لئے معیار خدا کی کتاب کو بناؤ کیونکہ وہی اس کا فیصلہ کر سکتی ہے کہ کون سی تقویٰ حقیقی ہے۔ جو اعمال قرآن کے متعین کردہ نتائج مرتب نہیں کرتے وہ رائگاں جاتے ہیں خواہ ان کی شکل و صورت کتنی ہی دینی اعمال کی سی کیوں نہ ہو، اور ان پر عمل کرنے والے کتنے ہی نیک نیت کیوں نہ ہوں۔ جب اعمال کے وہ نتائج مرتب نہ ہوں جو قرآن نے متعین کئے ہیں، تو دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ اسے اقبالؒ کے الفاظ میں سنیئے کہ:

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل　　　یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست　　　یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

(۰)

اس جماعت کی اتنی بڑی عالمگیر تنظیم کو دیکھ کر ہماری نگاہ کا رُخ کسی اور سمت کو مڑ جاتا ہے۔ تصوف کی کتابوں میں پڑھا تھا کہ ایک بہت بڑے پیر صاحب نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ ایک خضر صورت بزرگ ان سے کہہ رہے ہیں کہ اس مرتبہ حج اکبر ہو رہا ہے اور تم سو رہے ہو۔ اٹھو اور حج کی تیاریاں کرو۔ انہوں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اٹھ کر اپنے ارادہ سفرِ حج کا اعلان کر دیا۔ یہ سنکر ان کے لاکھوں مرید بھی حج کی تیاریاں کرنے لگ گئے کہ ایک تو حج بھی حجِ اکبر، اور دوسرے مرشد کی معیت اور اقتدا۔ یہ تحریک ملک گیر ہو گئی تو ان پیر صاحب کے مرشد نے ان سے کہا کہ یہ تم نے کیا پروگرام بنا لیا ہے؟ انہوں نے اپنے خواب کا ماجرا سنایا تو مرشد نے کہا کہ تمہیں معلوم ہے وہ بزرگوار کون تھے؟ وہ ابلیس تھا۔ انہوں نے کہا کہ یا حضرت! ابلیس کا کام تو نیک کاموں کے راستے میں روڑے اٹکانا ہے، اور اس نے مجھے حج پر جانے کے لئے بیدار کیا۔ یہ ابلیس کا کام کیسے ہو سکتا ہے؟ مرشد نے کہا کہ خلیفۂ وقت نے جہاد کا اعلان کیا ہے۔ ابلیس نے تمہیں حج کی طرف الجھا دیا ہے کہ تم اور تمہارے لاکھوں مرید جہاد میں حصہ نہ لے سکیں۔

یہ حکایت بڑی عظیم حقیقت کی پردہ کشا ہے۔ نیک نیت لوگوں کو زندگی کے بلند مقاصد (دین) کی طرف سے غافل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں چھوٹے چھوٹے "نیکی کے کاموں" میں الجھا دیا جائے اور اس طرح انہیں اس فریبِ نفس میں مبتلا کر دیا جائے کہ وہ بہت بڑے کارنامے سرانجام دے رہے ہیں۔ قرآنِ کریم نے فریبِ نفس (شیطانی عمل) کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ اَفَمَنۡ زُیِّنَ لَهٗ سُوۡٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا۔ (۳۵/۸) انسان کو اس کے غلط کام بھی بڑے جاذب اور حسین بنا کر دکھائی دیتے ہیں۔ ابلیس کی یہ ٹیکنیک ہر جگہ کامیاب ہو یا نہ ہو، لیکن مذہب کی دنیا میں اس کی یہ ٹیکنیک ہمیشہ کامیاب رہتی ہے کہ نیک اور نیک نیت افراد کی نگاہوں سے زندگی کے بلند مقاصد اوجھل کر کے، انہیں ظواہر پرستی میں الجھا دیا جائے۔ قرآنِ کریم نے اس غلط نگہی اور خود فریبی کا پردہ چاک کرنے کے لئے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ، اصل نیکی یہ نہیں کہ تم مشرق کی طرف منہ کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ اصل نیکی قرآنِ کریم کی ابدی صداقتوں پر ایمان لانے کے بعد اپنے مال و دولت کو اس کی کشش و جاذبیت کے علی الرغم، دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے، دیدینے میں ہے۔ یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے نظام کا نام ہے۔ اپنے قول و اقرار اور عہد و پیمان پورا کرنے کا نام ہے۔ اور اس کا راز اس میں ہے کہ تم مخالفین کے مقابلہ میں کس قدر استقامت و ثبات سے کام لیتے ہو۔ یہ ہے دعویٰ ایمان کی صداقت کا ثبوت۔ یہ ہے اصلِ تقویٰ۔ (۲/۱۷۷) اس وقت امتِ مسلمہ پوری کی پوری موت اور حیات کی کشمکش میں گرفتار ہے۔ جن لوگوں کے دل میں اسلام کا اور ملت کے ساتھ غمگساری کا جذبہ، خلوص اور ایثار کے جوہر موجود ہیں، ان کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ دشمنوں کی مخالفتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے منظم ہو جائیں۔ لیکن یہ حضرات،

ایسے نازک وقت میں' اس قسم کے نیکی کے کاموں " میں مصروف ہو رہے ہیں اور ساری قوم کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ بھی' اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ' اس قسم کے "ثواب کے کاموں" میں منہمک ہو جائیں۔ اقبال نے اپنی معرکہ آرا نظم (ابلیس کی مجلسِ شوریٰ) میں اس حقیقت کو بڑے دلآویز اور بصیرت افروز انداز میں منکشف کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جب ابلیس کے مشیروں نے اس سے یہ خطرہ ظاہر کیا کہ امتِ مسلمہ میں کچھ کچھ بیداری کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ ہمیں کیا کرنا چاہیئے جس سے یہ قوم بدستور محوِ خواب رہے تو اس نے اس کے لئے جو پروگرام تجویز کیا' اس میں اُن سے کہا کہ

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مُہرے ہوں مات

اور اس کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ :

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اُمت کے مخلص' ایثار پیشہ' فعال طبقہ کو "ذکر و فکرِ صبحگاہی" میں الجھا دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بساطِ زندگی میں اس کے سب مُہرے مات ہو جائینگے۔

اس امت کے ساتھ صدیوں سے یہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ اور آج بھی یہی ہو رہا ہے۔

وہی دیرینہ بیماری ' وہی نامحکمی دل کی

اور — علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

(۔۔۔۔)

پیشگی خریداری

آپ ایک روپے کی کتاب منگواتے ہیں تو اس پر کم از کم بارہ آنے ڈاک کے خرچ آجاتے ہیں۔ اگر آپ اپنے آپ کو پیشگی خریداروں کی فہرست میں شامل کرلیں تو آپ کا یہ سارا خرچ بچ سکتا ہے۔ اس کے لئے صرف اتنا کرنا ہوگا کہ آپ مبلغ ایک سو روپیہ پیشگی جمع کرا دیں۔ اس کے بعد آپ جو کتاب طلب فرمائیں گے وہ (بغیر ڈاک خرچ) آپ کو بھیج دی جائے گی۔ رسالہ طلوعِ اسلام کا چندہ بھی اُسی سے وضع کر لیا جائے گا اور آپ کا حساب باقاعدہ آپ کو بھیجدیا جائے گا۔

ان سہولتوں کے علاوہ آئندہ کنونشن کے موقع پر جو ماہ نومبر ۱۹۷۱ء کے آخری ہفتہ میں منعقد ہو رہا ہے' ادارہ کی کتابوں پر خصوصی رعایت دی جائے گی۔ جو احباب اس ماہ کی ۲۵ تاریخ تک پیشگی خریداری کی سکیم میں شامل ہو جائینگے وہ دہری رعایت کا فائدہ حاصل کر سکیں گے۔ ان خصوصی رعایتوں کا اعلان اسی شمارہ میں شائع کیا جا رہا ہے۔

(ناظم)

حقائق و عبر

نظریۂ پاکستان

آج کل نظریۂ پاکستان کے الفاظ پھر بڑی شد و مد سے دہرائے جا رہے ہیں۔ دراصل مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا اس نے اس نظریہ کی اہمیت کو شدت سے نمایاں کر دیا ہے اور اب، نچلی سطح سے لیکر اوپر تک، ہر مقام پر اس کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے۔ مثلاً جریدہ نوائے وقت کی ۲۹ ستمبر کی اشاعت کے اداریہ میں کہا گیا ہے۔

> گورنر پنجاب، لیفٹیننٹ جنرل عتیق الرحمان نے گلبرگ میں پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے زیرِ اہتمام "نظریۂ پاکستان اور نصابی کتب" کے موضوع پر مجلسِ مذاکرہ میں تقریر کرتے ہوئے غیر مبہم الفاظ میں کہا ہے کہ ایک نظریہ کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آنے والی مملکت صرف نظریاتی بنیادوں پر ہی قائم رہ سکتی ہے اور اس مملکت خداداد کی زندگی کا انحصار نوجوان نسل کو نظریات کی اہمیت دلانے پر ہے۔ اگر یہ نظریہ ختم ہو گیا تو ہم نیست و نابود ہو جائیں گے۔

پھر اسی اخبار نے اپنی ۸؍ اکتوبر کی اشاعت کے اداریہ میں لکھا ہے:۔

> صدر یحییٰ خان نے اسلام آباد یونیورسٹی نیو کیمپس کا افتتاح کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ ملکی یونیورسٹیاں دیگر مضامین کے ساتھ ساتھ طلبا کو نظریۂ پاکستان سے بھی روشناس کروائیں۔ آپ نے کہا کہ نظریۂ پاکستان کا مفہوم بتانا تعلیمی اداروں کا فرض ہے۔ حالیہ بحران کا ذکر کرتے ہوئے صدر نے کہا کہ موجودہ بحران نے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں نوجوانوں کو قومی نظریات اور قومی مقاصد سے آگاہ رکھنا چاہتی ہیں تو انہیں اپنا مکمل محاسبہ کرنا ہو گا۔

ہم "نظریۂ پاکستان" کے الفاظ چوبیس سال سے مسلسل سنتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ الفاظ محض رسمی نہیں۔ ان کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ گورنر پنجاب کے الفاظ میں، "اگر یہ نظریہ ختم ہو گیا تو ہم نیست و نابود ہو جائیں گے۔" اگر ایسا ہوا تو یہ مملکت باقی نہیں رہے گی۔

اس نظریہ کی اہمیت کا تو یہ عالم ہے کہ ہماری مملکت کے وجود اور خود ہماری بقا کا انحصار اس پر ہے لیکن اس کے باوجود اس کی طرف سے ہماری بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ آج تک کسی نے متعین طور پر نہیں بتایا کہ اس کا مفہوم کیا ہے؟ نظریۂ پاکستان کہتے کسے ہیں؟ اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں ہر پارٹی اپنی مخالف پارٹی کے خلاف الزام عائد کرتی ہے کہ وہ نظریۂ پاکستان کے مخالف ہے۔ اس کے خلاف حکومت کو مناسب کارروائی کرنی چاہیئے کیونکہ نظریۂ پاکستان کی مخالفت مملکت کے خلاف غداری کے مترادف ہے۔ اس نظریہ کے مفہوم کے عدم تعین اور ابہام کا نتیجہ ہے کہ اسی سیمینار کی جس میں گورنر پنجاب نے مندرجہ صدر الفاظ

ارشاد فرمائے تھے، ایک نشست کی صدارت پروفیسر حمید احمد خان نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر کے دوران فرمایا:

> دو قومی نظریہ کے تکرار کی اب ضرورت نہیں رہی۔ یہ منفی حقیقت ہے اور ہمیں اس سلسلہ کی مثبت حقیقت اسلام کا ذکر کرنا چاہیئے۔ ہم نے ہندوؤں سے علیحدہ قومی تشخص پر زور دیا اور پاکستان حاصل کر لیا۔
>
> (امروز۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۷۱ء)

یعنی ان صاحب کے نزدیک، دو قومی نظریہ محض ایک منفی دعوے تھا جسے حصولِ پاکستان کی خاطر اختیار کیا گیا تھا۔ پاکستان حاصل ہو گیا تو اب اس کے تکرار کی ضرورت نہیں رہی۔ اب ہمیں اس دعوے کو دہرانا نہیں چاہیئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان حضرت سے کوئی پوچھے کہ اگر دو قومی نظریہ محض ایک منفی دعوے تھا جس کے دہرانے کی اب ضرورت نہیں تو پھر وہ نظریۂ پاکستان کیا ہے جس پر اس مملکت کی اساس ہے۔ یہ ہے نتیجہ اس کا کہ نظریۂ پاکستان کے الفاظ اس شد و مد سے دہرانے کے باوجود، ہم نے آج تک یہ نہیں بتایا کہ اس نظریہ کا مفہوم کیا ہے۔

یہ الفاظ عام طور پر آپ نے سنے ہونگے کہ جس طرح پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کی ضرورت ہے اسی طرح اس کی نظریاتی سرحدوں کا تحفظ بھی لابد ہے۔ پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ انہیں تقسیم ہند کے معاً ساتھ متعین کیا گیا۔ (وہ تعین حدود غلط تھا یا صحیح، بہرحال ان حدود کا تعین کیا گیا) ان حدود کے مطابق نقشے پر لکیریں کھینچی گئیں اور زمین پر برجیاں لگائی گئیں۔ بین الاقوامی دستاویزات میں ان کی نشاندہی کی گئی اور ان سرحدوں پر پولیس بٹھائی گئی۔ اگر کسی نے خلاف ضابطہ ہماری سرحد کو عبور کرنا چاہا تو اسے گولی سے اڑا دیا۔ اگر ہندوستان کی حکومت کی طرف سے ایسا اقدام ہوا تو اسے دارننگ دی گئی اور جہاں اس نے اس کی پرواہ نہ کی، ان سے جنگ چھیڑ دی گئی۔

مملکت کی جغرافیائی حدود کے تعین اور تحفظ کے متعلق تو ہمارے احساس و اہتمام کا یہ عالم، لیکن اس کی نظریاتی سرحدوں کے سلسلہ میں یہ کیفیت کہ انہیں آج تک متعین ہی نہیں کیا گیا۔ اس سلسلہ میں ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں اور آج پھر دہراتے ہیں کہ یہ اشد ضروری ہے کہ دستورِ پاکستان میں نظریۂ پاکستان کا مفہوم واضح الفاظ میں بیان کیا جائے اور اس کے بعد اس کی صراحت کی جائے کہ اس نظریہ کے خلاف کچھ کہنا یا کرنا مملکت کے خلاف بغاوت قرار دیا جائیگا اور اس جرم کی سزا دہی ہوگی جو جرم بغاوت کی سزا ہوتی ہے۔ پھر اس مفہوم کو اسکولوں اور کالجوں کی نصابی کتب میں درج کیا جائے اور اس کی تشریح کے لئے الگ کتابیں لکھی جائیں۔

ہم ان تمام افراد اور جماعتوں سے جن کے دل میں مملکتِ پاکستان کے وجود، استحکام اور بقا کا تھوڑا سا جذبہ بھی موجود ہے، بزور درخواست کرینگے کہ وہ اس مطالبہ کو بتکرار و اصرار دہرائیں اور دیکھیں کہ آئندہ دستور پاکستان میں یہ شق درج کی جاتی ہے لیکن ایسا کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ایسے اہم اور بنیادی مسئلہ کے متعلق قوم کے صاحب الرائے طبقہ سے استصواب کیا جائے اور اسے اس شق کے مبہم الفاظ میں درج دستور نہ کر دیا جائے جیسے (مثلاً) یہ کہ "افرادِ مملکت کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی اسلامی قالب میں ڈھالیں"۔ یا یہ کہ "ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا"۔ ان ابہامات نے پہلے ہی قوم کو گرداب حیرت و انتشار میں گرفتار کر رکھا ہے۔ اس میں ایک اور ابہام کا اضافہ مزید پریشانی پیدا کرنے کا موجب بن جائے گا۔ ہم اس باب میں اپنی رائے کا اظہار متعدد بار کر چکے ہیں اور جب موقعہ آئے گا تو اس کا اظہار ایک بار پھر کر دیا جائے گا۔ اس وقت تو ہم صرف اس مشورہ پر اکتفا کرینگے، کہ اس کا متعین مفہوم، آئندہ دستورِ پاکستان کے اندر

درج ہونا چاہیئے جس نظریہ پر اس مملکت کی عمارت استوار ہے۔ اگر وہی اس کے دستور کی بنیاد نہیں ہوگا تو اس پر عمارت کس طرح اٹھے گی۔

(۰)

۲- مشرقی پاکستان میں کیا ہوا؟

مشرقی پاکستان کے آشوبِ قیامت کے سلسلہ میں جوں جوں تفاصیل منصۂ شہود پر آتی جاتی ہیں، نئے نئے حقائق منکشف ہوتے چلے جاتے ہیں۔ محترم نورالامین، پاکستان کے معمر ترین سیاست دانوں میں سے ہیں۔ وہ مشرقی پاکستان کے رہنے والے ہیں اور اس قیامت خیزی کے زمانے میں وہیں موجود تھے۔ گویا یہ سب کچھ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ اس سلسلہ میں ہفت روزہ جدیدہ چٹان (لاہور) کی ۲۷ ستمبر ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں ان کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں بعض نہایت اہم باتیں سامنے آئی ہیں۔ ہم اس انٹرویو میں سے دو ایک اقتباسات پیش قارئین کرتے ہیں۔

"سوال:- مشرقی پاکستان میں محب وطن عناصر کی انتخابی شکست کا سبب کیا ہے؟

جواب:- انتخابات سے قبل تقریباً ایک برس تک مشرقی پاکستان میں جو بے لگام پراپیگنڈہ چلتا رہا، میرے نزدیک وہ محب وطن عناصر کی شکست کا باعث ہے۔ اس ایک برس میں مشرقی پاکستان کے عوام کو مغربی پاکستان کے خلاف بالالتزام زہر نفرت پلایا گیا۔ جھوٹ کے لیے ہتھیے طومار باندھے گئے کہ عوام کو بے محابا مغربی پاکستان کے غاصب ہونے کا یقین ہو گیا اور ان کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ:

(۱) مشرقی پاکستان ایک زرخیز صوبہ ہے جسے مغربی پاکستان کے لوگوں نے ایکسپلائٹ کر کے استحصال کے ہاتھوں قبرستان بنا رکھا ہے۔

(۲) یہاں کا چاول مغربی پاکستان لے جا کر سستے داموں فروخت کیا جاتا ہے اور ہم لوگ یہاں ایک ایک دانے کو ترستے ہیں۔

(۳) مشرقی پاکستان میں پیسے سکے کا نہیں ایلومینیم کا ہے جو پانی کی سطح پر تیرتا اور مغربی پاکستان کا پیسہ پیتل کا ہے جو پانی میں ڈوب جاتا ہے۔

(۴) سونا اور چاندی اِدھر مہنگا اور مغربی پاکستان میں سستا ہے۔ اسکے علاوہ سیمنٹ لوہا اور تمام اشیائے صرف کا یہی حال ہے۔

(۵) یہ لوگ اس طرف سے ہماری کمائی لے جا کر گویا ہمارا خون چوستے ہیں۔ مشرقی پاکستان کا تمام روپیہ بنکوں کے ذریعے مغربی پاکستان پہنچ رہا ہے کیونکہ ان کے ہیڈ آفس اُدھر ہیں۔

(۶) کپڑے سے لیکر جوتوں تک تمام مصنوعات مغربی پاکستان سے اِدھر آتی اور مغربی پاکستان والوں کو منافع مہیا کرتی ہیں۔

ابلاغ عامہ کے تمام اداروں نے بھی اس باب میں ان علیحدگی پسندوں کا ساتھ دیا اور یہ ادارے بلاواسطہ نہیں تو بالواسطہ طور پر ان لوگوں کے ممد و معاون رہے۔ اس پراپیگنڈے کا دوسرا پہلو وہ وعدے تھے جو عوامی لیگ نے عوام الناس سے کئے کہ:

(۱) ہم اقتدار میں آتے ہی تمام غیر بنگالی اور مہاجرین کے کارخانے ضبط کر لیں گے اور انہیں غریب بنگالی عوام میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

(۲) عوامی لیگ اس تمام استحصال کا خاتمہ کرنے اور استحصالیوں سے انتقام لینے کا عہد کرتی ہے۔

(۳) ہم بنگالیوں کے اُن تمام حقوق کے لئے جد وجہد کرینگے جنہیں مغربی پاکستان کے غاصبوں نے دبا رکھا ہے۔

اس سلسلے میں جیسا کہ عرض کیا، ابلاغِ عامہ کے اداروں کا رویہ بڑا ہی افسوسناک تھا۔ ہم نے صدرِ مملکت کی توجہ اس طرف مبذول کرائی، مگر انہیں انتخابی مصروفیات نے فرصت نہ دی۔ غرض حکومت کو اس تمام صورتِ حالات کی اطلاع تھی مگر حکومت نے کوئی نوٹس نہ لیا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمام اشتعال انگیز اشتہارات سی۔ آئی۔ ڈی اور ملٹری انٹیلی جنس کی نگاہ سے ضرور گزرتے تھے جو بعد میں فسادات کا باعث ہوئے اور صورتِ حالات بے قابو ہو کر نفرت کھڑا ہو گیا۔

یہ پراپیگنڈہ طوفان کے دور میں بھی چلتا رہا۔ ہمارے قومی پریس کے علاوہ بین الاقوامی پریس نے بھی اس کی نشاندہی کی مگر حکومت جانے کیوں متوجہ نہ ہوئی۔ طوفان آیا تو مشرقی پاکستان کے گورنر ایڈمرل ایس۔ ایم۔ احسن نے مرکزی حکومت سے ایک امدادی ہیلی کاپٹر مانگا۔ وہ کسی وجہ سے نہ پہنچا تو گورنر نے ایک عجیب سی بات کہہ دی کہ مشرقی پاکستان میں غیر ملکی امداد، ملکی امداد سے پہلے آچکی تھی۔ ہم نے پراپیگنڈہ کے اس گرد و باد میں مضمر خطرات کو محسوس کرتے ہوئے انتخابات میں التوا کا مطالبہ کیا تاکہ قوم کی نفسیات پر اس کا بُرا اثر نہ پڑے۔ مگر افسوس کہ ہماری یہ خواہش صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ انہی دنوں شیخ مجیب الرحمٰن نے پریس کانفرنس میں علیحدگی سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا (NOT-YET) (ابھی نہیں!) خوف کی اس فضا میں انتخابات کا نتیجہ لامحالہ وہی نکلنا تھا جو نکلا۔ انتخابی مہم میں غیر ملکی پریس نے بھی مجیب کی حمایت کی اور عوام میں یہ تاثر پختہ ہو گیا کہ مجیب اور ان کی پارٹی ہی اُن کے صحیح خیر خواہ ہیں اور عوام کا یہی تاثر عوامی لیگ کی کامیابی کا اصل پیش خیمہ تھا۔"

اس کے بعد انہوں نے انتخابات کے بعد وہاں پیدا ہونے والے حالات کا ذکر کیا ہے اور قومی اسمبلی کے اجلاس کی تجویز سے سلسلۂ کلام کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

"جو اجلاس ۲۵ مارچ کو ہونے کا اعلان ہوا۔ مجیب اس پر بگڑ گئے اور پریس کانفرنس میں برملا طور پر ناراضی کا اعلان کر دیا پھر ان کی جانب سے عدمِ تعاون کی تحریک شروع ہوئی۔ تمام سرکاری ملازموں کو یہ دھمکی مل گئی کہ اگر کوئی افسر اپنے دفتر جائے گا تو اس کے بال بچوں کی گردن مار دی جائے گی۔ یہ اعلان عوامی لیگ کے جلسے میں ہوا۔ اگر حکومت نے کوئی معاونت (SUPPORT) یا محافظت (PROTECTION) نہ کی۔ انتظامی نظام ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ عوامی لیگ کی جانب سے روزانہ ایک ہدایت نامہ جاری کیا جاتا جس میں نوٹ مارنے سے متعلق تازہ ہدایت دی جاتیں۔ عوامی لیگ نے عملاً اپنی حکومت قائم کر لی۔ گورنر احسن اس دور میں بھی مجیب کے گھر جایا کرتے تھے۔ ان حالات عوام میں یہ تاثر پھیلنا مشکل نہ تھا کہ عوامی لیگ ہی دراصل حکومت ہے۔

اسی دوران میں صدرِ مملکت مجیب الرحمٰن سے ملنے گئے۔ خفیہ بات چیت ہوئی اور اخبارات میں خبریں آتی رہیں کہ سب ٹھیک ٹھاک جا رہا ہے۔ صدر کے ایڈوائزر مجیب کے ایڈوائزرز سے ملتے رہے۔ غرض اخباری اطلاعات کی حد تک کام آگے بڑھتا رہا۔ اسی اثنا میں بنگلہ دیش کا پرچم بنا لیا گیا۔ مشرقی پاکستان میں کوئی گاڑی اس پرچم کے بغیر نہ چل سکتی تھی۔ اس کے بغیر چلنے والی گاڑیاں تباہ کر دی گئیں۔ ۲۳ مارچ کو یومِ قراردادِ پاکستان کے موقعہ پر صدر وہاں تھے۔ عوامی لیگ نے اپنے جلسے میں فوج پر قابض فوج کا طعنہ توڑا۔ وہ لوگ اسے مغربی پاکستان کی فوج کہتے۔ ان کے نزدیک یہ قومی فوج نہیں تھی۔ نتیجۃً فوج سے خرید و فروخت بند ہو گئی۔ عوام نے اناج سے لے کر انڈے تک ہر شے فوج کو سپلائی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سے بھی قبل سات مارچ کو ریس کورس کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے مجیب الرحمٰن یہ اعلان کر چکے تھے کہ

"ہماری جدوجہد آزادی کی جدوجہد ہے۔"

اس جلسے میں عوامی لیگ کے بجائے، بنگلہ دیش کا پرچم لہرایا گیا تھا۔ ان تمام واقعات کے نتیجے میں مار دھاڑ، قتل وغارت گری کا وہ بازار گرم ہوا کہ الامان! یوں لگتا تھا جیسے یہاں کوئی قانون ہی نہیں۔

آخر ۲۵ مارچ کی رات کو ایکشن لیا گیا جو دریں حالات ضروری ہو گیا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اگر چند روز اور یہ اعلان نہ ہوتا تو بنگلہ دیش قائم ہو چکا تھا۔"

اس سلسلہ میں انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ "عوامی لیگ نے انتخابات کے فوراً بعد ایک ریلی منعقد کی جس میں عوامی لیگ کے تمام منتخبہ نمائندوں نے اپنے پارٹی پروگرام سے وفاداری کا حلف لیا۔"

(۵)

۳۔ شب برأت

شب برأت اس سال بھی حسب معمول تمام مروجہ توہمات و خرافات کو اپنے ساتھ لے کر آئی اور چلی گئی۔ اس سلسلہ میں جو کچھ عام طور پر بیان ہوتا ہے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ یہ ان پڑھ مولویوں اور واعظوں کے وضع کردہ افسانے ہیں۔ ان کا کوئی خیال نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن اس دفعہ، مولویوں کے نہیں، بلکہ دانشوران مملکت کے نمائندہ اخبار، پاکستان ٹائمز (۵ اکتوبر کی اشاعت) میں "شب برأت کی برکات" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس پر صاحب مقالہ کا نام تو درج نہیں لیکن اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جسے ان پڑھ واعظوں کے افسانے کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے۔ مثلاً اس میں لکھا ہے کہ اس رات خدائے تعالیٰ سب سے نچلے (یعنی زمین سے قریب تر) آسمان پر اترتے ہیں اور پکار پکار کر کہتے ہیں کہ اے میرے گنہگار بندو! آؤ۔ میں تمہارے گناہ معاف کر دونگا۔ جو سعادت مند گنہگار" اس پکار پر لبیک کہہ کر خدا سے معافی کا خواستگار ہوتا ہے اس کے سب گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔

اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس رات ہر انسان کے مقدرات کا فیصلہ ہوتا ہے جو اسے آنے والے سال میں پیش آنے ہوتے ہیں۔ یعنی اس میں ہر انسان کی قسمت یا تقدیر کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اتنا لکھنے کے بعد صاحب مقالہ کو خیال آیا کہ یہ باتیں قدامت پرستی کی ہیں اور میں مضمون انگریزی زبان میں لکھ رہا ہوں جو ماڈرن لوگوں کی زبان ہے۔ اس لئے مجھے ماڈرن بھی بننا چاہیئے۔ چنانچہ ماڈرن بننے کے اس چاؤ میں انہوں نے علامہ اقبال کی تشکیل جدید کا حوالہ دیا اور لکھا کہ

> جس طرح یہ کائنات ایک مکمل شے نہیں اسی طرح انسان کی تقدیر بھی متعین اور پہلے سے طے شدہ نہیں۔ اقبال کے نزدیک، انسان اپنی تقدیر کا آپ مالک ہے۔

اور یہ لکھتے ہوئے یہ محقق بھول گئے کہ تقدیر کا یہ تصور ان کے اس تصور کی تردید کر رہا ہے جسے انہوں نے ابھی ابھی بیان کیا ہے۔ یعنی وہ یہ بھول گئے کہ جو کچھ کسی فرد کو آنے والے سال میں پیش آنا ہے، اگر اس کا فیصلہ شب برأت میں پہلے سے کر دیا جاتا ہے تو پھر انسان اپنی تقدیر کا آپ مالک کیسے رہا۔ اور یہ کس طرح کہا جائے گا کہ انسان کی تقدیر پہلے سے متعین نہیں ہوتی۔

لیکن نہ لکھنے والے نے اتنا سوچنے کی ضرورت محسوس فرمائی، نہ پاکستان ٹائمز کے ارباب فکر نے اتنا غور کرنے کی

زحمت، مقصدِ شب برأت کی برکات حاصل کرنے سے تھا، وہ حاصل ہوگئیں اور اخبار "اسلامی" بھی بن گیا۔ قوم کا لکھا پڑھا طبقہ اگر اس سے برگشتہ ہوتا ہے تو ہوتا ہے۔

پھر ۵ اکتوبر کی شام، لاہور ٹیلیویژن پر ایک بہت بڑے مولوی صاحب نمودار ہوئے۔ انہوں نے، اس شب مبارک کی فضیلتیں بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اسے خود قرآن کریم نے شبِ مبارک کہہ کر پکارا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے سورۂ دخان کی یہ آیات تلاوت فرمائیں، کہ:

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ ۚ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ ۔ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ (۴۴/۳-۴)

ہم نے اس قرآن کو ایک مبارک رات میں نازل کیا تاکہ انسانوں کو آگاہ کر دیا جائے کہ ان کے لئے صحیح راستہ کون سا ہے۔ اس میں ان تمام امور کو جو آسمانی حکمت پر مبنی ہیں (غلط امور سے) الگ کرکے بتا دیا گیا ہے۔

انہوں نے فرمایا کہ یہ وہ رات ہے جس میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا۔۔۔ اور ایسا کہتے وقت یہ بھول گئے کہ خدا نے کہا ہے کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ - (۲/۱۸۵) "نزولِ قرآن کا آغاز رمضان کے مہینے میں ہوا تھا" لہٰذا جس رات میں اس کے نزول کا آغاز ہوا تھا، وہ رمضان کی کوئی رات ہوگی نہ کہ شعبان کی پندرھویں رات۔

لیکن ایسا سوچنے کی نہ مولوی صاحب کو ضرورت محسوس ہوئی، نہ ٹیلیویژن کے اربابِ دانش و بینش کو۔ مقصد، اس رات کی نسبت سے کوئی "اسلامی پروگرام" پیش کرنا تھا، سو کر دیا گیا۔

ہم ان حضرات سے صرف ایک سوال کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ اگر آپ کسی فرم میں رنج کے ملازم ہوں اور وہاں آپ اسی قسم کی کھلی ہوئی متضاد باتوں کا اعلان کرنا شروع کر دیں، تو کیا آپ وہاں ملازمت میں رہ سکیں گے؟

ضمناً، ہمارے ہاں جس قدر "اسلامی تقاریب" منائی جاتی ہیں، ان کے متعلق کچھ نہ کچھ بتا دیا جاتا ہے کہ یہ فلاں واقعہ کی یاد میں ہے۔ لیکن شبِ برأت کی تقریب ایسی ہے جس کے متعلق کوئی نہیں بتا سکتا کہ یہ کس واقعہ کی یاد میں منائی جاتی ہے۔ اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے (کہ جیسا کہ شیخ علی بن ابراہیم نے اپنے ایک رسالہ میں لکھا ہے) عباسیوں کے وزیر برامکہ مجوسی تھے۔ وہ مسلمان ہوئے تو اپنے قدیم مذہب مجوسیت کی آتش پرستی اور عقیدہ تقدیر کو اپنے تحت الشعور کی گہرائیوں میں اپنے ساتھ لائے۔ چنانچہ انہوں نے آتش پرستی کی رسم کو تازہ کرنے کے لئے، اس رات کو آتشبازی کیلئے مختص کیا اور پھر (ظاہر ہے کہ) اس کی فضیلت میں دو چار روایات وضع کر لی گئیں۔ یہ ہے وہ واقعہ جس کی یاد ہر سال آتشبازی اور عقیدۂ تقدیر کی شکل میں صدیوں سے تازہ کی جاتی ہے۔

باقی رہا حلوہ، سو اس کے متعلق ایک واعظ بیان فرماتے تھے کہ جب غزوۂ اُحد میں حضور نبی اکرمؐ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے ہیں تو آپ کوئی ٹھوس غذا تناول نہیں فرما سکتے تھے۔ اس لئے حضرت فاطمہؓ نے آپ کے لئے حلوہ تیار فرمایا۔ اس طرح حلوہ کھانا مسنون قرار پا گیا۔

انسانی ذہن کی طرفہ تماشگی کی داد دینی پڑتی ہے۔

۴۔ عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ——— ورنہ

ورنہ آج اہلِ ایران فخر و مباہات سے اعلان نہ کرتے کہ ہم اپنی اڑھائی ہزار سالہ شاہنشاہی کا جشن منا رہے ہیں۔ اور نہ ہی اس غلغلہ و طنطنہ سے اس جشن کا عالمگیر اہتمام کرتے۔ مسلمان کے لئے ملوکیت کی طرف اپنی نسبت کرنا باعثِ ندامت ہونا چاہیئے نہ کہ وجہِ مفاخرت۔

مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں سینکڑوں مسائل میں باہمی اختلاف ہے لیکن اس کے باوجود بعض مبادیاتِ دین ایسے بھی ہیں جن میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ ان مسلمات میں ایک یہ بھی ہے کہ اسلام میں ملوکیت حرام ہے۔ اس مسئلہ کا تعلق اسلام کی فروعات سے نہیں بلکہ اصلِ دین سے ہے اور یہی وجہ ہے کہ عصرِ حاضر کے واقفِ رموزِ دیں حکیم الامت نے اس شد و مد سے تصورِ ملوکیت کے خلاف جہاد کیا ہے۔ مثلاً آپ اُن کے آخری مجموعۂ کلام "ارمغانِ حجاز" کے ان قطعات کو دیکھئے اور غور کیجئے کہ شہنشاہیت کے خلاف اُن کے جذبات کی شدت کا کیا عالم تھا۔ وہ کہتے ہیں۔

عرب خود را بہ نورِ مصطفےٰ سوخت چراغِ مردۂ مشرق برافروخت
ولیکن آں خلافت راہ گم کرد کہ اول مومناں را شاہی آموخت

پھر کہتے ہیں کہ:

خلافت بر مقامِ ماگواہی است حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

ایک اور

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است نظامش خام و کارش ناتمام است
غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم کہ در دینش ملوکیت حرام است۔

انہیں مسلمانوں کے خلاف سب سے بڑی شکایت اس المیہ کی وجہ سے ہے کہ انہوں نے ؎

خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

اور ملوکیت کی تباہ کاریاں اور انسانیت سوزیاں گناتے ہوئے کہتے ہیں ؎

از ملوکیت نگہ گردد دگر عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

قرآن نے آکر ملوکیت کے تصور کی جڑ کاٹ دی اور اس طرح ایک ایسی امت وجود میں آگئی جو رنگ، نسل، خون، زبان، وطن کے تمام خود ساختہ رشتوں سے بلند ہو کر ناموسِ الٰہیہ کے رشتے میں منسلک ہو گئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ جیسا کہ حضرت علامہ نے کہا ہے، یہ بدنصیب امت پھر سے ملوکیت کے جہنم میں جا گری لیکن اس کے باوجود نظری اور اعتقادی طور پر اس نے ہمیشہ اس کے خلاف اِبا کیا۔ اس دور میں، بالخصوص جبکہ دنیا کی غیر مسلم قومیں بھی اس اندازِ سیاست کو چھوڑ کر رفتہ رفتہ شورائیت کی طرف آ رہی ہیں، ملوکیت پر فخر کرنے کے کچھ معنی سمجھ میں نہیں آتے اور پھر طرفہ تماشہ یہ کہ مسلمانانِ عالم کی قریب قریب ہر مملکت اس جشن میں شریک ہو رہی ہے اور کسی نے بھی اس کے خلاف ایک لفظ تک نہیں کہا۔

دینی نقطۂ نگاہ سے الگ ہٹ کر تاریخی زاویہ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو اس اڑھائی ہزار سال کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔

آج سے چودہ سو سال پہلے جب عرب مسلمانوں نے ایران کو فتح کیا تو دارا اور کیخسرو کی شہنشاہیت کا خاتمہ ہوگیا اور اس شہنشاہیت ہی کا خاتمہ نہیں ہوا، اہلِ ایران کے ہاتھ سے سلطنت بھی نکل گئی اور اس انقطاع کا سلسلہ ایک مدت تک رہا۔ بنا بریں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ تاریخی تسلسل کون سا ہے جسے اڑھائی ہزار سال سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ جہاں تک ایرانی شہنشاہوں کی نسل کا تعلق ہے تو اس زمانے کے کسریٰ — یزدگرد — نے شکست کھانے کے بعد جگہ جگہ کی خاک چھانی لیکن اُسے کہیں پناہ نہ مل سکی۔ اُس نے جان بچانے کے لئے ایک چکّی میں اپنے آپ کو چھپایا اور وہیں قتل ہوگیا۔ اُس کے بیٹے فیروز نے چین میں فوجی ملازمت اختیار کی۔ اس کے بعد اُس کے بیٹے نے اپنے دادا کی عظمتِ رفتہ کی بازیابی کے لئے موہوم سی کوشش کی لیکن ناکامی کی موت مرگیا۔ یوں ساسانیوں کی نسل کا خاتمہ ہوگیا اور اس طرح حضور رسالتمآبؐ کے اس ارشادِ گرامی کی تصدیق ہوگئی کہ

"جب یہ کسریٰ ہلاک ہوجائے گا تو اُس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں ہوگا۔"

جہاں تک موجودہ شہنشاہِ ایران کا تعلق ہے، ان کی بادشاہت پر کوئی لمبا عرصہ گزرا ہی نہیں۔ ان حالات میں اس تقریب کا جذبۂ محرکہ اس کے سوا کچھ اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اہلِ ایران اسلام کے دور سے پیچھے جا کر اپنا رشتہ قدیم مجوسیوں سے ملانے میں فخر محسوس کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اڑھائی ہزار سال کی مدت کا آغاز کیخسرو (CYRUS) سے کرتے ہیں اور اُن کے پروگرام میں یہ بھی شامل ہے کہ یہ جشن اس کی قبر پر جا کر منایا جائے۔ اس سلسلہ میں ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ

ببیں کہ از کہ بریدی و باکہ پیوستی؟

امتِ محمدیہ کے لئے تو نسبت ایک ہی قابلِ فخر و مباہات ہوسکتی ہے اور وہ نسبت ہے حضور خاتم النبیینؐ کے اُمتی ہونے کی۔

اگر بہ ایں نرسیدی تمام بولہبی است

مملکتِ ایران کے ساتھ ہمارے دوستانہ تعلقات ہیں اور اس تعلق کی بنا پر ہمارے دل میں اہلِ ایران اور ان کے سربراہِ مملکت کا احترام ہے لیکن جب سوال دین کے کسی اصول کا آجائے تو اُس وقت دنیا کا کوئی رشتہ اور قلب اور ذہن کا کوئی رجحان و میلان اُس کے راستے میں حائل نہیں ہونا چاہیئے۔ اور یہی وہ جذبہ ہے جس کے ماتحت ہم اپنے دکھتے ہوئے دل کی یہ صدائے دردناک لب تک لانے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ خدا کرے کہ اس سے راہ گم کردہ مسلمان کی آنکھ کھل جائے اور وہ پھر سے قرآن کے رشتے میں منسلک ہو کر امتِ واحدہ کے پیکر میں ڈھل جائے اور اس طرح اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرے کہ — عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا — یہ وہ حقیقت تھی جس کی شہادت خود ایران ہی کے ایک مردِ مومن نے اس انداز سے دی تھی کہ جب اُن سے پوچھا گیا — نام؟ — تو جواب دیا "سلمانؓ"! اور جب پوچھا گیا "باپ کا نام؟" تو جواب دیا۔ "اسلام"۔ خدا رحمت کرے مولانا جامیؒ پر جنہوں نے اس حقیقت کو اس حسین انداز میں بیان کیا کہ

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

(۸ر اکتوبر)

(—○—)

۵۔ ابتدائے عشق ہے

آج ۱۰ر اکتوبر ۱۹۷۱ء کے اخبارات (ہمارے سامنے لکھتے وقت کے پرچے)

میں حسب ذیل سرخیاں دو۲ سوانہ درج ہوئیں۔

(۱) پنجاب کے سات اضلاع میں نہری پانی میں نوے فیصد کمی کر دی گئی۔ ملتان اور بہاولپور ڈویژن میں کھڑی فصلوں کے تباہ ہو جانے کا اندیشہ۔

(۲) سندھی افسر نہری پانی کی کمی کا بہانہ بنا کر پنجاب کو پانی کے جائز حق سے محروم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

(۳) ضلع لاہور کو سیراب کرنے والی نہر پندرہ دن سے خشک پڑی ہے۔

(۴) ساہیوال اور بعض دوسرے علاقوں میں نہری پانی میں پچاس فیصد کی کمی۔

بھارت اور پاکستان میں جو امور متنازعہ فیہ ہیں، اُن میں سرفہرست دریاؤں کے پانی کی تقسیم کا مسئلہ ہے۔ طاس سندھ کے تنازعہ کا قصہ تو پرانا ہو گیا ہے لیکن فرخا بند کا قضیہ تو ہم آج بھی اقوام متحدہ کے ایوان کے سامنے لا رہے ہیں اور اُن سے کہہ رہے ہیں کہ اگر اس مسئلہ کا منصفانہ تصفیہ نہ ہوا تو بھارت اور پاکستان میں جنگ چھڑ جانے کا امکان ہے۔

یہ بھارت اور پاکستان کی بات تھی۔ اور آج ہمارے سامنے خود مملکتِ پاکستان کے دو صوبوں کے باہمی روابط کا نقشہ کچھ اس طرح سامنے آ رہا ہے کہ ایک صوبہ دوسرے صوبے کا گلا گھونٹنے کی فکر کر رہا ہے اور دوسرا صوبہ اُس کے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے۔ یہ صوبجاتی خود مختاری کے ذہنی تصور کی ابتداء ہے۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

چھپے ہوئے نشتر

اشتراکی نظریات کے پراپیگنڈے کا انداز ایسا لطیف (SUBTLE) ہوتا ہے کہ ان کی نوکِ نشتر انسان کے تحت الشعور کی گہرائیوں تک جا پہنچتی ہے۔ لیکن نہ کوئی آنکھ اُسے دیکھ سکتی ہے، نہ مریض کو اس کا احساس ہوتا ہے۔ ڈرامہ اس کا موثر ترین ذریعہ ہوتا ہے، اور عصرِ حاضر میں ٹیلیویژن اس کا کامیاب ترین آلۂ ابلاغ۔ چنانچہ آجکل ہمارے ٹیلی ویژن سے یہی کام لیا جا رہا ہے۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ ہم اس کے ہر پروگرام کا جائزہ لیکر تفصیلی طور پر بتائیں کہ وہاں سے کس قسم کی غیر مرئی اور غیر محسوس زہر نشانی ہوتی رہتی ہے اسلئے ہم دو ایک مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۱) گزشتہ کئی ماہ سے ایک ڈرامہ بالاقساط پیش کیا جاتا رہا جس کا عنوان تھا "رات کی آنکھیں" اس میں سمگلروں کی زندگی کو روشنی میں لایا گیا ہے کہ وہ کس طرح دیکھتے ہی دیکھتے کروڑپتی بن جاتے ہیں۔ اس کے لئے انہیں کون کونسے حربے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ وہ اپنے ایک جرم کو چھپانے کے لئے کتنے اور سنگین جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں اور اس میں کتنے لوگوں کو ملوث کرتے چلے جاتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس قدر دولت و ثروت اور ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی بسر کرنے کے باوجود وہ کس قدر الم انگیز کرب و ضیق میں مبتلائے عذاب رہتے ہیں اور ان کا انجام کس قدر عبرتناک ہوتا ہے۔ یہاں تک تو عام طور پر بات صاف چلتی ہے لیکن اس کی آخری قسط کے آخری سین کے الفاظ میں وہ سب کچھ کہہ دیا جاتا ہے جو اس سارے ڈرامے کا مقصود تھا۔ سین یہ ہے کہ سمگلر، کسٹم ڈیپارٹمنٹ کے چھاپہ ماروں کے ہاتھوں گولی کھا کر مر جاتا ہے۔ اس کی لاش کے سرہانے اس کا ہمدرد

فلاسفر دوست (رہبری) آتا ہے اور کہتا ہے کہ خالد! تمہارا انجام کس قدر حسرت ناک ہوا۔ لیکن تم جو کچھ بن گئے اور جو کچھ تم نے کیا، تم اسکے ذمہ دار نہیں۔ اس کا ذمہ دار یہ معاشرہ ہے۔

اشتراکیین کی ٹیکنیک یہ ہے کہ وہ معاشرہ میں خلفشار و انتشار پھیلاتے، فسادات کی آگ بھڑکانے اور جرائم کو عام کرنے کے لئے اس نظریہ کا پرچار کرتے رہتے ہیں کہ ان خرابیوں کا ذمہ دار فرد نہیں بلکہ معاشرہ ہے اور اس کا علاج افراد کی اصلاح و تربیت نہیں معاشرہ میں انقلاب برپا کرنا ہے۔ اس نظریہ کی رُو سے فسادات برپا اور جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کے حوصلے دراز ہو جاتے ہیں کیونکہ جرم کے احساس کا بوجھ ان کے ضمیر پہ باقی نہیں رہتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان بدکرداریوں اور جرائم کوشیوں کی ذمہ داری ہم پر عاید نہیں ہوتی۔ اس کا ذمہ دار معاشرہ ہے جس میں فرد مجبور ہوتا ہے۔ یہ خالصتہً مارکسی نظریہ ہے جس کی اس لطیف اور جاذب طریق سے نشر و اشاعت کی جا رہی ہے۔

(۲) دوسری مثال اس ڈرامے سے پیش کی جاتی ہے جس کا سلسلہ ابھی ابھی شروع ہوا ہے۔ اس کی پہلی کڑی "دامن کی آگ" کے عنوان سے ۱۰ اکتوبر کی شب پیش کی گئی۔ اس میں ایک پاکستانی مسلمان فوجی کپتان (جنگِ کشمیر کے دوران) ہندوستان جیل میں انتہائی اذیت ناک صعوبتیں برداشت کرتا دکھایا گیا ہے۔ جیل کے ایک (غیر مسلم) تھانیدار کے دل میں ہمدردی کا جذبہ ابھرتا ہے اور وہ اس کے جیل سے فرار ہو جانے کی اسکیم بناتا ہے۔ یہ (مسلمان) قیدی اس سے پوچھتا ہے کہ کیا تم مسلمان ہو؟ اس کے جواب میں وہ جو کچھ کہتا ہے اس کا مفہوم یہ تھا کہ خدا جانے تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ تم انسانوں کا تعارف ہمیشہ مذہب کے حوالے سے چاہتے ہو اور معراجِ انسانیت کے اس مقام کو نہیں دیکھتے جس تک انسان خالصتہً انسانی ہمدردی سے پہنچ جاتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ اس ایک فقرہ میں مذہب کے خلاف کیا کچھ نہیں کہہ دیا گیا۔

ضمناً اس ڈرامے سے مجموعی تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندو جس قدر مظالم پاکستانی مسلمانوں پر کرتے ہیں یہ درحقیقت ردّ عمل ہے ان مظالم کا جو تقسیمِ ہند کے زمانے میں پاکستانی مسلمانوں نے ہندوؤں پر کئے تھے۔

یہ ہے مجملاً وہ زہر جو ہمارے ٹیلیویژن کے ذریعے اس فضا میں پھیلایا جا رہا ہے جس میں ہماری نئی نسل سانس لے کر جوان ہو رہی ہے۔ اس کے بعد بھارت کو کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو!

عوام کا حافظہ اتنا کمزور نہیں

روزنامہ مساوات کی دس اکتوبر کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

"جماعت اسلامی کا اخبار جسارت کراچی (نو اکتوبر) کے صفحہ اول پر جلی اور رنگین حروف میں ایوب آمریت کے خلاف ۱۹۶۹ء کی تحریک میں حصہ لینے والوں کو پاکستان کا دشمن قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے۔۔۔ "صدر ایوب خان اپنے آخری زمانہ میں اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ پاکستان کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ جلد از جلد اسلامی اور جمہوری دستور کو لایا جائے اور اس مقصد کے لئے بالغ رائے دہی کے اصول پر انتخاب کرائے جائیں اور بعض سیاستدان تیار ہو گئے تھے کہ یہ نیک کام ان کے ہاتھ سے کرایا جائے۔ تاکہ فوج کو ملوث کئے بغیر اقتدار عوام کے سپرد ہو سکے اور ملک کو کسی بڑی کشمکش یا بحران سے بچا لیا جائے۔ لیکن پاکستان

کے کچھ دشمن عناصر غرض مند سیاستدانوں کو اپنا آلۂ کار بنانے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے اس قسم کا ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ صدر ایوب خان مجبور ہو گئے کہ عنانِ حکومت فوج کے سربراہ کے سپرد کر دیں اور اس طرح ملک میں مارشل لاء نافذ ہو گیا۔"

اس میں شبہ نہیں کہ عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے، لیکن جماعت اسلامی خود فریبی میں مبتلا ہے اگر وہ یہ سمجھتی ہے کہ ان کا حافظہ اس حد تک کمزور ہے کہ وہ دو تین برس کے پہلے کے واقعات بھی بھول چکے ہیں۔ ملک کے عوام اور خواص سب جانتے ہیں کہ صدر ایوب جس اقدام کے لئے مجبور کر دیئے گئے تھے وہ نتیجہ تھا ان ہنگاموں اور شورشوں کا جو ملک میں عام کر دی گئی تھیں۔ اور یہ ہنگامے اور شورشیں پیدا کردہ تھیں نفرت اور انتقام کی اس آگ کی جسے جماعت اسلامی مسلسل دس سال سے صدر ایوب کے خلاف (حسب معمول اسلام کے نقاب میں) بھڑکائی چلی آ رہی تھی اور جسے اس کی آفریدہ طلبا کی سرپھری فوج نے ۱۹۶۸ء میں انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ ہمیں اس کا احساس و اعتراف ہے کہ بعض دیگر عناصر نے بھی اس صورت حالات سے فائدہ اٹھایا تھا، لیکن بنیادی طور پر یہ حالات پیدا کردہ تھے جماعت اسلامی ہی کی مسلسل مہم کے۔ اس باب میں جماعت اسلامی کا مداح جریدہ چٹان اپنی ۱۱ اکتوبر کی اشاعت میں لکھتا ہے کہ

"ایوب خان کے خلاف سب سے زیادہ جلوس تو دولتانہ، مودودی اور نصر اللہ خان نے نکالے تھے۔ لیکن ان کے جلوس ان کے پرانے مسخ شدہ کردار اور عوام دشمنی کو چھپا نہ سکے جبکہ ان کے مقابلہ میں بھٹو کا چہرہ بوجوہ تر و تازہ نظر آیا۔" (ص ۱۲)

باقی رہی گول میز کانفرنس کی ناکامی سو اس کے ذمہ دار وہ حضرات تھے جنہوں نے صدر ایوب کو اگرتلہ کیس واپس لینے اور شیخ مجیب الرحمٰن کو بلا مشروط رہا کر کے شریک کانفرنس کرنے پر مجبور کیا تھا (ہمارے نزدیک یہ صدر ایوب کی کمزوری تھی یا فیصلہ کی غلطی)۔ مجیب نے کانفرنس میں آتے ہی اپنے چھ نکات پیش کر دیئے تھے جس پر صدر ایوب نے کہا تھا کہ ان نکات کے تسلیم کر لینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اپنے ہاتھوں مملکتِ پاکستان کو ختم کر دیں۔ میں ایسا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے بجائے میں اسے ترجیح دوں گا کہ میں زمامِ حکومت سے دستبردار ہو کر اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں۔ اس کے بعد جو آپ کے جی میں آئے کریں (ہم سمجھتے ہیں کہ صدر ایوب نے ایسا ہی کرنا تھا تو مجیب کی رہائی کے مطالبہ پر ایسا کرتے) بہرحال یہ تھے وہ حالات جن کے ماتحت صدر ایوب نے زمامِ اقتدار فوج کے حوالے کی تھی اور اس کی بنیادی ذمہ داری جماعتِ اسلامی کے سر پر عاید ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب آنے والا مورخ اس دور کی تاریخ لکھیگا تو وہ اس جماعت کا نام ان عناصر کے سرفہرست لکھے گا جو مملکتِ پاکستان کی تخریب میں سرگرم عمل رہے۔ آپ اس مملکت کی چوبیس سالہ سرگزشت پر پھیلتی ہوئی نگاہ ڈالئے۔ آپ کو نظر آئے گا کہ اس جماعت نے اس بدقسمت ملک کو نہ ایک دن کے لئے چین سے بیٹھنے دیا اور نہ کسی حکومت کو اطمینان سے کوئی کام کرنے دیا۔ تقسیم ہند سے پہلے ان کے امیر کا مسلک یہ تھا کہ تحریک پاکستان کی مرکزی قیادت میرے سپرد کرو، ورنہ میں اس تحریک کو غیر اسلامی قرار دے کر عوام کو اس کی مخالفت پر بھڑکاتا رہوں گا۔ انہیں وہاں جو استخوان شکن شکست ملی تو وہ اس انتقام کی آگ سینے میں دبائے پاکستان آ گئے۔ اب یہاں ان کا مسلک یہ ہے کہ زمامِ اقتدار ہمارے حوالے کرو (کیونکہ ہم ہی اسلام کے واحد اجارہ دار ہیں) ورنہ ہم اس مملکت کو باقی نہیں رہنے دینگے۔ صدر ایوب کے خلاف تحریک بھی اسی پروگرام کی ایک کڑی تھی۔ جہاں تک ان کے دعوائے تحفظِ اسلام کا تعلق ہے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگا لیجئے کہ اس زمانے میں انہوں نے رٹ لگا رکھی تھی کہ عائلی قوانین خلافِ اسلام ہیں اور خاندانی منصوبہ بندی سے دین

کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے دس سال تک اس جہاد کو جاری رکھا۔ اب عائلی قوانین بھی ملک میں بدستور رائج ہیں اور خاندانی منصوبہ بندی کا محکمہ بھی بدستور (بلکہ پہلے سے زیادہ وسعت کے ساتھ) مصروف کار ہے۔ لیکن اب اس جماعت کی طرف سے ان کے خلاف ایک لفظ تک بھی نہیں کہا جاتا۔ اب اسلام کو ان سے کوئی خطرہ نہیں رہا۔

یہ ہے وہ جماعت جو اب عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہی ہے کہ موجودہ عسکری نظام مسلط کرانے کے ذمہ دار ہم نہیں۔ دوسرے "پاکستان دشمن عناصر" ہیں ۔۔۔ جس جماعت کے نزدیک زندگی کی اہم ضروریات کے لئے جھوٹ بولنا شرعاً واجب ہو جاتا ہو، وہ جو کچھ بھی کہہ دے، اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔

(×××)

انسانی مسائل کے حل ہیں

عقل انسانی آج تک کن کن ارتقائی مراحل سے گزری اور اس نے کہاں کہاں اور کیا کیا ٹھوکریں کھائیں۔ تاریخ انسانی کی یہ عبرت آموز تفصیل آپ کو پرویز صاحب کی مشہور تصنیف

انسان نے کیا سوچا

میں مل جائے گی۔

ہزاروں کتابوں کا نچوڑ۔ افلاطون اعظم سے لیکر آج تک گزشتہ اڑھائی ہزار سال میں دنیا کے چوٹی کے مفکرین، مؤرخین اور علمائے اخلاقیات و عمرانیات اور ماہرین معاشیات و سیاسیات نے کیا سوچا؟

اسے پڑھئے اور سوچئے کہ وحی کی روشنی سے روگرداں اور محروم ہو کر نوعِ انسانی نے اپنے لئے کیا جہنم خرید لیا ہے!

قیمت
بارہ روپے

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ لاہور

میجر نصرت جہاں بیگ تمغۂ قائدِ اعظم
(آرمڈ فورسز نرسنگ سروس)

سنو راشد!

بہت دفعہ میرا دل چاہا کہ میں بھی کچھ لکھوں، مگر جرأت اس لئے نہ کر سکی کہ میں کوئی قلمکار نہیں ہوں۔ اور ذہن میں اتنی ڈھیر ساری داستانیں اُبل رہی ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ انہیں لکھ لکھ کر ساری قوم کو سناتی رہوں ——— اُن بہادر سپاہیوں کی داستانیں جنہوں نے وطن عزیز کی خاطر اپنا سب کچھ ہنستے کھیلتے قربان کر دیا۔ لیکن میں اُن میں سے کسی ایک کی بھی کہانی ابھی تک نہ سنا سکی۔ اور ———

اور ——— اس روز ٹیلیویژن پر راشد منہاس کے بارے میں انٹرویو دیکھنے کے بعد لکھنے کی یہ خواہش اس شدت سے ابھری کہ میں نے لکھنا شروع کر دیا ——— اُس جنگ کے بارے میں جسے میں نے بہت قریب سے دیکھا تھا...... ہاں راشد بھیا! میں اس جنگ میں ایک ایسے اپریشن تھیٹر کی انچارج تھی جو محاذ کے نزدیک تھا اور پورے سترہ روز دن رات مجھے شہیدوں، غازیوں، مجاہدوں اور بہادروں کو نزدیک سے دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

وہ جنگ کیا تھی راشد؟ وہ جذبۂ اتحاد کی آزمائش، ولولے اور عزم کی آزمائش تھی۔ حق و باطل میں جنگ تھی۔ اور راشد! آج بھی مجھے اس جنگ کا ایک ایک لمحہ یوں یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔

مثلاً مجھے وہ سپاہی کیسے بھول سکتا ہے جس کے پیٹ میں گولہ لگا تھا اور اپریشن کرنے پر پتہ چلا تھا کہ اس کا جگر چھلنی ہو گیا ہے۔ خیال یہی تھا کہ وہ اپریشن کے بعد بمشکل چند گھنٹے ہی زندہ رہ سکے گا۔ اُسے وارڈ میں بھجوا دیا گیا۔ میں کسی ضروری کام سے وارڈ میں گئی تو میں نے اُس دراز قد اور چوڑے چکلے سینے والے سپاہی کو وارڈ سے باہر کی طرف بھاگتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ کے ساتھ گلوکوز کی ٹیوب اور سوئی ابھی تک بندھی تھی۔ میں نے اُسے چلتے ہوئے دیکھا تو اُسے روکنا چاہا لیکن مجھ اکیلی سے سنبھالا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے ایک نرسنگ اسسٹنٹ کی مدد سے اسے پکڑ کر واپس لانا چاہا تو وہ مجھ سے یوں مخاطب ہوا۔ "ٹھہرو، تم مسلمان ہو؟"

"ہاں بھئی! میں مسلمان ہوں" میں نے جواب دیا۔

"مسلمان ہو تو کلمہ پڑھو!" اور اس نے بڑے جلال سے کہا۔ "کیسی مسلمان ہو جو مجھے محاذ پر جانے سے روک رہی ہو! تمہیں معلوم نہیں جنگ ہو رہی ہے؟ ——— کفر اور اسلام میں جنگ۔ اور تم مجھے روک رہی ہو! مجھے جانے دو!

اور "جانے دو" اس قدر جوش سے کہا کہ میں سہم گئی۔

اور وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوا: "اگر میں نہیں جاؤں گا تو میری گاڑی کون چلائے گا؟ اور گاڑی نہ گئی تو پٹرول نہیں آئے گا...... اور پٹرول نہیں آئے گا تو باقی گاڑیاں کیسے چلیں گی؟ اور اگر ہم آگے نہیں جائیں گے تو...... تو......"

اور اتنی دیر میں وہ نڈھال ہو گیا تھا۔ ہم نے جلدی سے اُسے بستر پر لٹایا۔ نبضیں اور کمزور ہو گئی تھیں۔ ٹھنڈے پسینے کے قطرے

اُس کی پیشانی پر نمودار ہوئے اور اس نے آنکھیں موند لیں۔
میں نے جلدی سے اُسے آکسیجن اور انجکشن دیئے لیکن یہ مردِ مومن اپنی مراد پا چکا تھا۔ اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ وہ شہید ہو چکا تھا۔
آخری سانس لیتے ہوئے اُس نے اور کچھ نہ کہا۔ کسی کو یاد نہ کیا۔ اور میں کھڑی یہ سوچ رہی تھی کہ اس کے گھر والے بھی ہونگے۔ ماں، بہنیں، بیوی، بچے۔ مگر اسے ان میں سے کوئی بھی یاد نہ آیا۔ اُسے یاد آیا تو صرف محاذِ جنگ اور اپنی ڈیوٹی۔
اور راشد بھیا، میں سفید چادر اس کے منہ پر ڈال کر باہر نکل آئی تھی۔
میں مزید کچھ سوچنا نہ چاہتی تھی۔ میں کس کس کے لئے سوچتی؟ وہ تو سب ایک نئی جذبے سے سرشار تھے۔ قوم پر مرمٹنے کی ... ناقابلِ شکست خواہش! فرض کی لگن اور خدمت کی پکار مجھے سوچنے کی فرصت بھی نہ دیتی تھی۔ ابتداء میں جو چند لمحات سوچا تو کلیجہ منہ کو آگیا۔

راشد! مجھے یاد ہے جب محاذ سے سب سے پہلا سپاہی اپریشن تھیٹر میں لایا گیا تھا، اس کی دونوں ٹانگیں کٹ چکی تھیں۔ اور اس کے بوٹ علیحدہ ٹانگوں میں پڑے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر میں نے زور زور سے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا تھا اور میرے ایک کرنل صاحب نے کہا تھا "تم کس کس کے لئے روؤ گی۔ اور روؤ گی تو پھر کام کون کرے گا؟ شہیدوں کو رونے کی بجائے غازیوں کو بچانا زیادہ ضروری ہے" ـــــ اور مجھے صبر آگیا تھا۔ راشد! میں نے سوچا لڑائی اسی کو کہتے ہیں۔
اور میں اُن سترہ روز میں اپنے آنسوؤں کو اندر ہی اندر جذب کرتی رہی یا پھر چھپ چھپ کر روتی رہی۔ کیوں؟ ـــ یہ تو میں بتانے سے قاصر ہوں۔ راشد! یہ وہی جانتے ہیں جو وہاں موجود تھے۔ جب کبھی وارڈ سے میرا گزر ہوتا تھا تو میں نے کبھی ان جیالوں کو کسی قسم کی شکایت یا فریاد کرتے نہ سنا تھا۔ بلکہ جب بھی ریڈیو پر کوئی ترانہ آیا کرتا تو یہ لوگ نعرے لگایا کرتے تھے۔ اور سفید سفید کپڑوں والی نرسوں کے چہرے اُس وقت اُن کی خوشی کے ساتھ چمک اُٹھتے تھے۔ سفید سفید کپڑوں والی یہ نرسیں اپنے جیالے سپاہیوں کی خدمت میں اپنے آپ کو محو رکھا کرتی تھیں۔ انہیں اپنے کھانے پینے کی کوئی ہوش نہ ہوتی تھی۔ وہ سارا سارا دن مصروف رہتیں اور تھکن کی جھلک بھی اُن کے چہروں پر نہ آتی تھی۔ مجھے تو وہ نرسیں بھی نہیں بھولتیں جو دوسرے ہسپتالوں سے ہماری مدد کو آیا کرتی تھیں۔ اُن کا جذبۂ خدمت! اللہ اللہ! راشد! رات کی ڈیوٹی والی اپنے ہسپتال میں کرتی تھیں اور دن کو ادھر آجاتی تھیں۔ انہیں کوئی نہ کہتا تھا وہ خود کرتی تھیں۔ راشد! بڑی بے غرض اور بے لوث ہوتی ہیں یہ سفید کپڑوں میں چلتی پھرتی حوریں! ان کے سینوں میں ہزاروں داستانیں دفن ہیں جنہیں اگر کبھی کریدو تو اُن گنت افسانے بن جائیں ـــ! حقیقت سے بھرپور افسانے۔
اور راشد! مجھے وہ سپاہی بھی یاد ہے ـــ کس کس کو یاد کروں! تم سن سن کر تنگ تو نہیں آگئے؟ ـــ ہاں راشد بھیا! وہ سپاہی تھا لیفٹیننٹ حبیب، جو ۷ ستمبر کی صبح صبح بھاگا بھاگا آیا تھا اور اپنا خون دینے پر بضد تھا۔ اور ہم نے جب اسے وردی میں دیکھا تو اس کا خون لینے سے انکار کر دیا۔ خون لینے والے ہمارے شعبے کے انچارج میجر صاحب نے اسے کہا کہ بھئی تم جاؤ لڑائی کرو۔ ہم تمہارے لئے خون کا بندوبست کریں گے" لیکن وہ کہاں ٹلنے والا تھا۔ بڑی بے چینی سے بولا۔ "جلدی کیجئے سر! مجھے واپس رپورٹ کرنی ہے۔ اور ہم لوگوں کو جلد محاذ پر پہنچنا ہے۔ آپ میرا خون لے لیں میرے کسی سپاہی بھائی کے کام آجائے گا"
اور یوں اُس نے ہمیں مجبور کر دیا کہ اس کا خون لے لیں اور ہم نے اس کا خون لے کر بلڈ بنک میں جمع کرا دیا۔
۷ ستمبر کی رات کو انسپکشن روم میں کچھ مریض آئے۔ میں بھی دیکھنے گئی کہ کوئی زیادہ خطرناک ہو تو اسے فوراً اپریشن تھیٹر میں

لے جائیں۔ میں وہاں پہنچی ہی تھی کہ میرے یونیفارم کو کسی نے پکڑ کر کھینچا .... راشد! اور تم جانتے ہو وہ کون تھا؟ — یہ وہی حبیب تھا جو ایک دن پہلے خون دے کر گیا تھا۔ وہ شدید زخمی تھا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ اُس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے اسے کہا: دیکھا ہم نہ کہتے تھے تم جاؤ، لڑائی کرو اور ہم تمہاری حفاظت کا بندوبست کر لیں گے"۔

اور راشد! جب ہم نے اسے بتایا کہ اسی کا خون اسے واپس دیا جائے گا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے ہم سے التجا کی وہ خون کسی اور کو دے دیں۔ اور پھر راشد! وہ سپاہی — وہ جیالا بہادر — چند دن زندہ رہ کر شہیدوں میں اپنا نام لکھوا گیا اور میرے ذہن میں نہ مٹنے والی داستان چھوڑ گیا کیونکہ مرنے سے پہلے وہ بار بار جنگ کا حال پوچھ رہا تھا یا ہمارا حال پوچھ رہا تھا اور میں اپنے آنسو اس سے چھپا رہی تھی کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھ لے کہ خدانخواستہ ہم جنگ ہار رہے ہیں۔ یہ آنسو تو حبیب کی شہادت کے خیال سے بہہ رہے تھے۔

راشد! یہ سب کیا تھا! — میں نہیں سمجھ سکتی۔ ایک عجیب جذبہ تھا۔ یہ جنگ صرف سپاہیوں نے نہیں ساری قوم نے لڑی تھی۔ کس طرح؟ اس کی مثالیں ناقابلِ یقین ہیں۔

ایک شام (شاید ۱۳ یا ۱۴ ستمبر کی شام تھی) میں اور میرے کرنل صاحب سڑک پر کھڑے ایمبولینس سے مریض اتروا رہے تھے۔ ایک غریب اور بہت ہی ناتواں سا بزرگ اچانک ہمارے پاس آ کھڑا ہو گیا اور بھرائی ہوئی آواز میں ہاتھ باندھ کر کہنے لگا۔ "جناب! میں ایک غریب آدمی ہوں۔ یہ چند چیزیں آج کی کمائی سے لایا ہوں۔ یہ میری طرف سے میرے بہادر غازیوں کو نذرانہ پہنچا دیں"۔ اُس کے کانپتے ہاتھوں میں تیل کی ایک شیشی اور سگرٹوں کی چند ڈبیاں تھیں۔ سارا دن مانگنے والا یہ بھکاری اپنے وطن کے عزیز بیٹوں کے لئے یہ نذرانہ نہ جانے کتنی مصیبتوں سے گزر کر لایا تھا۔ اس نے کس طرح اندر آنے کے لئے کوشش کی ہوگی۔ اس کا ہمیں اندازہ تھا۔ لیکن اُس کے اس نذرانے کو کرنل صاحب نے جب ہاتھ میں پکڑا تو نہ جانے کیوں کرنل صاحب کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ چیزیں مجھے پکڑا کر انہوں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا — کیوں ....!

راشد بھیا! اُس روز تمہارے متعلق ٹیلیویژن پر اناؤنس ہو رہے تھے۔ نہ جانے کیوں اُس روز سارا دن میری آنکھوں میں نمی سی تھی۔ میں نے اپنی ایک پرانی فائل نکالی۔ اُس میں سے ایک تصویر کے سامنے تمہاری تصویر رکھ کر میں کہیں دور بہت دور کھو گئی تھی۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کا ایک ایک دن مجھے یاد آ گیا۔ میں ایک سپاہی کی میت کے پاس کھڑی ہوں۔ اُس کی آدھ کھلی آنکھیں یوں لگ رہی تھیں جیسے اب بھی اپنی سرحدوں کی حفاظت کر رہی ہیں، اور اُس وقت تک کرتی رہیں گی جب تک کوئی انہیں یہ نہ بتلائے گا کہ وہ اپنے وطنِ عزیز کو مضبوط ہاتھوں میں چھوڑ کر جا رہی ہیں۔

اُس وقت بھیا مجھے یہ اندازہ بھی نہ تھا کہ میری آنکھیں ایک عظیم ہستی، ایک ہیرو، ایک نشانِ حیدر کی میت پر جمی ہوتی ہیں۔ نشانِ حیدر .... حیدر کرار کا نام اور روایات زندہ رکھنے والے پر۔!

پھر .... پھر .... اُس جنگ کی یادیں آہستہ آہستہ ہمارے دلوں میں دھندلی ہو رہی تھیں کہ اچانک ہم ایک المناک دوراہے پر آ کھڑے ہوئے۔ ہمارے مکار دشمن نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ناکامی کے بعد اپنا مشن جاری رکھا اور ہمیں ہمارے ہی ہاتھوں لٹوا دیا۔ لاکھوں بے گناہ لوگوں کو بے رحمی کی موت سلا دیا — ایسا کیوں ہوا؟ — سب جانتے ہیں۔ یہ ہمارے مکار دشمن کی چال تھی۔ وہ اپنے اس ذلیل منصوبے میں کامیابی کے خواب دیکھ رہا تھا کہ ایک بار پھر اُسے منہ کی کھانی پڑی اور یوں ہمارے جیالے نوجوان سرحدوں کے محافظ بن کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے ہو گئے اور انشاء اللہ اپنے وطنِ عزیز کی ایک انچ زمین

پر بھی دشمن کے ناپاک قدم آگے نہ بڑھنے دیں گے۔

ننھے مجاہد، بہادر راشد! آج پھر قوم کو ایک بہادر سپاہی کی بہادری نے جگا دیا ہے۔ راشد! جب سے تمہاری بہادری کے کارنامے کی خبر سنی ہے میری آنکھیں پُرنم رہتی ہیں۔ بھیا! تم بھی عزیز بھٹی، سرور، طفیل شہید کی طرح ہم سب کے لئے ایک نئی راہ روشن کر گئے ہو۔ قربانی کی ایک نئی مثال جس نے قوم کے بچے بچے کی رگوں میں خون گرم دوڑا دیا ہے.....

بھیا! بات تو تمہارے گھر والوں کے انٹرویو کی ہو رہی تھی۔ ٹیلیویژن پر تمہارے گھر والوں اور دوستوں کا انٹرویو دیکھا۔ بار بار تمہاری معصوم سی تصویر بھی سامنے آتی تھی اور سر عقیدت سے جھک جاتا تھا۔ اس روز ساری قوم کی نظریں تمہاری امی، تمہارے ابا، اور تمہارے بہن بھائیوں کے چہروں پر لگی ہوئی تھیں۔ تمہاری امی کا صبر دیکھ کر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ کتنے عظیم ہیں تمہارے گھر والے! تمہاری امی! اُف! صبر کی تصویر بنی بیٹھی تھیں، اور میں سوچ رہی تھی کتنی خوش قسمت ماں ہے۔ اللہ میاں ہر ماں کی گود سے ایسا راشد پیدا کرے...... اور پھر تمہاری آپا جی! ان کے چار لفظوں نے تو ہم سب کو رُلا ہی دیا تھا۔ وہ اب بھی تمہاری منتظر ہیں۔ شاید تم دوبارہ آنے کا وعدہ کر گئے تھے۔

راشد بھیا! تم شہید ہو گئے ہو۔ تم ایک ایسا جذبہ چھوڑ گئے ہو جس نے ہماری قوم کے نوجوانوں کو دوبارہ جگا دیا ہے۔ اس قوم کے بچے فخر سے تمہارا نام لیتے ہیں کیونکہ جو مثال تم نے قائم کی ہے اس نے قربانی کے جذبے کو دوبارہ اس مقام پر لا کھڑا کر دیا ہے جو میں نے ۶۵ء کی جنگ میں دیکھا تھا۔ خداوند کریم اس قوم کے ہر بچے کو یہ فخر نصیب کرے۔ آمین!

راشد بھیا! میں تمہاری اور عزیز بھٹی کی تصویر کی بات کر رہی تھی۔ ہاں میرے ننھے بھیا! میں ان دونوں تصویروں کو غور سے دیکھ رہی ہوں۔ ان کی آنکھیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک جیسی گہرائی ہے۔ ان دونوں کی آنکھوں میں ایک ایسا سمندر موجزن ہے جس کے اندر پوری قوم سما کر رہ گئی ہے۔ یہ عزیز بھٹی کی آنکھیں تھیں جو راشد کی آنکھیں بن گئیں اور ان آنکھوں نے ایک بار پھر دشمن کی مکارانہ چالوں کو بھانپ کر انہیں ناکام بنا دیا ہے۔

زندہ باد راشد! تمہاری بہنیں تم پر فخر کرتی ہیں۔ شہید کبھی نہیں مرتے۔ تم بھی زندہ جاوید ہو ـــ عزیز بھٹی کی طرح، طفیل اور سرور کی طرح ـــ جو ہمیں ہمت، استقلال، عزم اور قربانی کی نئی راہیں دکھاتے رہیں گے۔!

راشد بھیا! تم زندہ ہو، زندہ رہو گے اور ہم سب تم پر فخر کرتے رہیں گے۔ میرے ننھے بھیا ـــ نشانِ حیدر!"

(بصد شکریہ ہلال، راولپنڈی)

طلوعِ اسلام:- ہم ملت کی اس مایۂ ناز بیٹی، میجر نصرت جہاں بیگ سے درخواست کریں گے کہ وہ اپنے اس قسم کے مشاہدات و تاثرات کو یکجا قلمبند کر کے شائع کر دے کہ ان کی یاد قوم کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑانے کا ذریعہ بنے گی اور یہ چیز ملک، قوم اور اسلام کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ قارئین ہم سے متفق ہوں گے کہ ہماری یہ واجب الاحترام عزیزہ قلمکاری کی مدعی نہ ہونے کے باوجود، اس مقام پر ہیں جہاں بڑے بڑے قلمکار اپنے قلم رکھ کر بیٹھ جائیں۔ اس لئے کہ یہ جو کچھ لکھتی ہیں، قلم کو اپنے خونِ جگر میں ڈبو کر لکھتی ہیں۔ وَ ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔ اللہ اس قلم کو ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھے۔

(جون)